حصہ اول

عمر خیام

ہیرالڈ لیم

مترجم جمیل نقوی

Presented by : S A M I
Sami_fcs@hotmail.com(0321-6622750)

Умари Хайём - Omar Khayam

دیباچہ

اس معرکۃ الآرا ناول کا مصنف ہیرلڈ لیم نیویارک کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست نیوجرسی کے علاقے الپائن میں یکم ستمبر ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا۔ وہ پیدائشی معذور تھا۔ اس کی آنکھوں، کانوں اور زبان میں فطری نقائص تھے۔ وہ صحیح طور پر نہ سن سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا۔ اس کے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ بڑا ہی صبر آزما تھا۔

بہر حال جوں توں کر کے اس نے تعلیم حاصل کی۔ قدرتی جسمانی نقائص نے لیم کو تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ اپنا بیشتر وقت کتب خانوں میں بیٹھ کر کتابوں کے مطالعے میں گزارتا تھا۔ بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس کے جسمانی نقائص آہستہ آہستہ دور ہونے شروع ہوئے اور 1916ء میں اس نے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے گریجویشن کیا۔ 1917ء میں شادی کے بعد امریکہ متحدہ کے مغربی حصے میں بود و باش اختیار کی۔

ابتدا ہی سے ہیرلڈ لیم کو ایشیائی باشندوں کی تاریخ کے مطالعے کا شوق تھا۔ ان ممالک کے متعلق یادداشتوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے ذاتی کتب خانے میں ایران، شرق اوسط، روس اور چین وغیرہ کی تاریخوں کی بڑی تعداد اکٹھا کر لی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اسے مشرق بعید اور مشرق قریب کے ممالک کے سفر کا بھی موقع ملا۔

ہیرلڈ لیم نے ''عمر خیام'' (1934) کے علاوہ مندرجہ ذیل گرانقدر ناول بھی لکھے

ہیں:

چنگیز خاں (1927) تیمور لنگ (1928)، صلیبی جنگیں (1930)، نور محل (1932)، گروی بچوں کے لیے (1933)، بربریوں کے محاربات (1940)۔

تاریخی مضامین لکھنے کا سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے جاری تھا اور نیویارک ٹائمز میں افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جو زیادہ مشرقی باشندوں کی روزمرہ زندگی، تہذیب اور ثقافت پر مبنی ہوتے تھے۔ اپنی ادبی و تحقیقی تصانیف کے اعتراف میں کئی تمغے بھی حاصل کیے اور افسانہ نگاری سے ناول نویسی کی طرف رخ کیا اور امریکی ادب میں ایشیائی تہذیب و تمدن کو روشناس کرانے کا سہرا لیم ہی کے سر ہے۔

جمیل نقوی

الجمیل، اے۔١٩١ بلاک جے

شمالی ناظم آباد، کراچی ٣٣

☆☆☆

مقدمہ

تاریخ فی نفسہ خشک سہی محض نفس الامر، لیکن جب فنکار کا جمالیاتی شعور اس کو اجاگر کرتا ہے تو اس میں بھی آب و رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کے خشک واقعات بھی تروتازہ نظر آنے لگتے ہیں۔ تخیل کی یہیں لہروں میں نیا جادو جگا دیتی ہے۔ یہ سب جوہر قابل کی قوت مشاہدہ، پرواز تخیل، تخلیقی صلاحیت اور قوت بیان پر موقوف ہے کہ وہ دور کی حقیقتوں کو محسوس کرے اور ان ہیں اس طرح سے ابھار کر سامنے لے آئے کہ ان کی تصویر نظروں میں ہو بہو ویسی ہی پھر جائے کہ جیسے پردہ یہیں پر جیتی جاگتی رواں دواں تصاویر۔ ہمارے یہاں بے شمار داستانیں، امیر حمزہ، بوستان خیال وغیرہ طلسمات کا بے پایاں دفتر ہیں۔ اگرچہ ان میں تمام تر تخیل میں محیر العقول ہنگامہ آرائی ہے اور اس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی جو عملاً بسر کی جاتی ہے۔ میرا مطلب ہے چلی پھرتی زندگی اور اس کی سرگرمیاں۔

زیادہ اہم، کم از کم موجودہ حقیقت پرست زمانے میں ایسی تخلیقات ہیں۔ جن میں زندگی کے کوائف و احوال میں پوری طرح ڈوب کر اسے بھرپور رچاؤ کے ساتھ محسوس مرئی شکل عطا کرے اور ہم افسانہ و حقیقت، نفس الامر اور تخیل کے دہرے کیف سے سرشار ہوں اور زندگی کو سچ مچ اپنے اصلی رنگ میں مشاہدہ کریں جیسے ہم اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہیرلڈ لیم جیسے نادر مصنف کا تذکرہ ناگزیر ہے جس کو اس قسم کی

داستان طرازی کو فروغ دینے میں منفرد حیثیت حاصل ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ مغربی مصنف ہونے کے باوجود اس نے مشرقی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بلکہ اس طرح اپنایا ہے گویا کہ اس کی اپنی دنیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اہل مغرب کے لیے بے حد دشوار ہے۔ کیونکہ ان کی دنیا مشرق کی دنیا سے کوسوں دور ہے۔ لیکن لیم اس لحاظ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ اس دنیا خصوصاً اسلامی دنیا سے اہل مشرق سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تعجب ہے کہ مشرقی کو جس طرح مغربی مصنفوں نے پیش کیا ہے وہ خود مشرقی مصنفوں کو نصیب نہیں۔ جیسا کہ رباعیات عمر خیام' ایڈون آرنلڈ کی ''لائف آف ایشیا'' اور ''اسلامک روزری'' مالو کے ''ٹیمر لین'' حاجی باب اصفہانی اور مشرقی تحریک کے بے شمار علمبرداروں کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔

صاحب قرانی تیمور ہو یا شاعر و مہندس عمر خیام' لیم ان کا شریک سفر ہی نہیں' ہم عصر' ہم نشین اور ہم نوالہ و ہم پیالہ معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ ان تمام اشخاص کا جو اس کے زیر نظر ناول ''عمر خیام'' میں پیش کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان تمام مقامات سے بھی پوری طرح واقف ہے جو اس کی اس تصنیف کا محل وقوع ہیں جیسے اس نے اپنی تمام زندگی انہی میں گزاری ہو۔ اور وہ ہر ہر شہر گلی گلی کوچہ کوچہ لوگوں کے طور طریق رہن سہن' معمولات اور روزمرہ کے واقعات سے ذاتی طور پر واقف ہو بعین جیسے کسی سپہ سالار کو میدان جنگ کا مکمل نقشہ پیش نظر ہو۔ تعجب ہے کہ اس نے اس قدر اور باریک سے باریک باتیں کیسے معلوم کیں۔

عمر خیال پر لیم کی تصنیف اس لیے بھی اور بھی اہم ہے کہ اس میں شہرہ آفاق شاعر

کی شخصیت اس کے گوناگوں کمالات اور کوائف حیات کو بالتفصیل تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جامعیت کا یہ اہتمام یہاں تک ہے کہ افراد کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ معاشرے اور تمام ملک کے عروج و زوال کا نقشہ اور اس کے اسباب واضح کیے گئے ہیں۔ جیسے پردہ سیمیں کے سینما اسکوپ پر جو متحرک تصویر پیش کی جارہی ہے ناظر خود بھی اس میں شامل ہو۔

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ عمر خیام کی شخصیت اور زندگی کسی بھی نادر روزگار باکمال شخصیت کا المیہ ہے اور دل پر بے مہری زمانہ اور نیرنگ روزگار کا گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ یہ تاثر ہی بجائے خود فنی کمال کی بہترین علامت ہے۔ کیونکہ پیش کش کی اہمیت تمام تر ندرت تصور پر موقوف ہوتی ہے۔ ایسی تصنیفات غیر معمولی ثقافتی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جس طرح عمر خیال کی رباعیات عالمی فکر کا لازمی حصہ ہیں۔ اسی طرح تمام عالمی شاہکار نوع انسان کے مشترکہ ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انہیں ہر زبان میں منتقل ہونا چاہیے۔

میرے فاضل دوست جمیل نقوی نے اس گرانقدر تصنیف کو اردو میں پیش کر کے بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے ارادہ ہی بڑی ہمت کی بات ہے۔ چہ جائیکہ اس مہم کو جوہفت خواں سے کم نہیں فی الحقیقت سر کیا جائے اور وہ بھی باحسن ترین وجوہ۔

ترجمہ بجائے خود ایک اہم تہذیبی عمل ہے۔ اس قدر اہم کہ ہم شاذ و نادر اس کا تصور کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت عالم فکر و نظر اور تہذیب و تمدن کو ایک ہی سطح پر لانے کا

ذریعہ ہے۔ اگر یہ عمل رک جائے تو دنیا کی ترقی بھی رک جائے یہ بین الاقوامی داد و ستد کا مسلسل عمل ہے جو حیات کو برابر تازگی بخش اور تنگنائے کو فراخنائے میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اگر نصرانیت کو عالمگیر فروغ حاصل ہے اور دنیائے مغربی پر آج تک اس کا تسلط ہے۔ تو اکا ایک موثر ذریعہ انجیل مقدس کے ترجمے کے سوا اور کیا تھا؟ اور دنیا کے وسیع حصے پر اسلام کا جو اثر ہے اس میں قرآن مجید کے تراجم کو کس قدر دخل ہے؟ ملکی فتوحات کا اثر مسلم لیکن یہ جلد ہی زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن تراجم کا دامن بچا کر مانوس وضع پیدا کرنا ہے یعنی عبارت اپنی زبان میں۔

مجھے مسرت ہے کہ پیش نظر ترجمہ میں جمیل نقوی کی تخلیقی صلاحیتیں برقرار رہی ہیں۔ انہوں نے ترجمہ بڑی وفاداری سے کیا ہے۔ لیکن اس میں ناگوار حد تک وفاداری کی کوئی علامت محسوس نہیں ہوتی۔ مترجم کی طباعی کے جوہر ہر کہیں نمایاں ہیں۔ جو اس کی پیش کش کا حاصل ہیں۔ اگر اردو ادب کو قوس قزح کہا جائے تو اس کے سات رنگوں میں اس کا رنگ بھی ایک بھرپور کیف کے ساتھ شامل ہے۔

مترجم کے ذوق و شوق سے امید ہے کہ وہ ادبی خدمات کے اس سلسلہ کو جاری رکھے گا۔ جس کا وہ اپنی دیگر متعدد تصنیفات میں ثبوت فراہم کر چکا ہے۔

پروفیسر رفیق خاور

☆☆☆

باب اول

نیشاپور کے قدیم شہر میں کتب فروشوں کی گلی 1069ء میں

وہ گلی جامع مسجد سے پارک تک جاتی تھی دھوپ سے بچاؤ کے لیے اس کے اوپر انگور کی بیلیں پھیلا کر چھت سی پاٹ دی گئی تھی۔ دور چلنے کے بعد جہاں سے گلی مڑتی تھی وہاں پانی کا ایک چشمہ تھا۔ اور اس کے قریب ہی چنار کا ایک تناور درخت کھڑا تھا۔

جو عورتیں پانی بھرنے آتی تھیں وہ بڑے شوق سے چشمے کے کنارے بیٹھتیں اور اپنے گھڑے رکھ کر آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ مرد کتابوں کی دکانوں میں بیٹھے اونگھتے رہتے اور جب مسجد کے مکتب سے لڑکے پڑھ کر نکلتے تو وہ دوڑتے ہوئے آواز لگاتے ''پرانی کتابیں بیچنے والو! جاگ اٹھو!''

اس آوازے سے یاسمین دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتی' چونکہ اس کے چہرے پر بچکانہ نقاب ہوتی تھی اس لیے لڑکے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے۔ مردوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتے' وہ اس کے پاس سے گزر جاتے۔ البتہ کبھی کبھی یاسمین کی بھوری بلی پر پتھر ضرور پھینکتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکوں کے چہرے سبزہ آغاز تھے۔

یاسمین کی عمر تقریباً بارہ سال ہوگی۔ وہ خود کو حسین بھی سمجھتی تھی۔ اسی وجہ سے

اسے اپنے چہرے پر سفید رنگ کا نصف بچانا نقاب ڈالنا کسی طرح پسند نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر میں چہرے پر پورا نقاب ڈالوں اور جھلملیوں کی اوٹ سے لڑکوں کو جھانکوں تو وہ ضرور میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ یاسمین کو کتابوں کی دکان پر اپنے باپ کی مدد بھی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا باپ بوڑھا اور کمزور تھا باریک لکھے ہوئے قلمی نسخوں کو پڑھتے پڑھتے اس کی بینائی قریب قریب جاتی رہی تھی۔ اپنی بیٹی کے مقابلے میں اسے بوعلی سینا کی کسی مجلّا ومطلّا کتاب کا ایک ورق زیادہ عزیز تھا۔ اور گھر کی مستورات یاسمین کو اس وقت یاد کرتیں۔ جب انہیں اس سے کوئی کام لینا ہوتا تھا۔

جب اس کا باپ لڑکوں کو کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تو بعض اوقات وہ بھی سننے لگتی لیکن اسے ذرا بھی مزا نہ آتا۔ رات کے وقت آسمان پر جنگلی ہنس کی شکل نمودار ہونے یا اس پردے کی بحث جو غیر مرئی اشیاء پر پڑا ہے اسے کیسی دلچسپی ہو سکتی تھی وہ سوچتی تھی کہ اس قسم کے مسائل کا سمجھنا مردوں کا ہی حصہ ہے' لڑکیوں کے اندر اتنی صلاحیت نہیں ہے۔ مرنے کے بعد انہیں وہی جگہ ملے گی جو کتوں اور ریلیوں کے لیے مخصوص ہے۔

یاسمین اپنے باپ کی دوکان پر جھاڑو بارو کرتی' جو چیز اس کے باپ کو نظر نہ آتی وہ اٹھا کر دیتی اور اس کی ضروریات کے لیے زنان خانے میں آتی جاتی۔ فرصت کے لمحوں میں یا تو وہ بڑی بے دلی سے سر بند کاڑھتی یا پھر بلی کے بھورے بچے سے کھیلتی رہتی اور ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے کتب فروشوں کی گلی کا پورا منظر نظر کے سامنے

رہے۔

دو لڑکے نسبتاً دوسروں سے عمر میں بڑے تھے۔ اکثر اس کے باپ کی دکان پر آتے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا قد ذرا نکلتا ہوا تھا ایک زمیندار کا بیٹا رحیم زادہ تھا۔ اس کی سرخ اور بھورے رنگ کی عبا یاسمین کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرا لڑکا اتنی دیر سر جھکائے کتابیں پڑھتا رہتا کہ اندھیرا ہو جاتا اور دکان دار مغرب کی نماز کے لیے دکانوں سے باہر نکل آتے۔

رحیم نے جس دن شام کو ایک خاص مصور مجلّا اور مطلا کتاب خریدی اس کا باپ گلی کے موڑ سے یاسمین کے لیے مٹھائی خرید لایا غریبوں کو ایسی نعمتیں کبھی کبھار نصیب ہوتی ہیں۔ یاسمین مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہی تھی اور اس کا باپ سوچ رہا تھا کہ ''دراصل رحیم کو کتاب کی وہ تصویر پسند تھی جو جلد کی پشت پر بنی ہوئی تھی اور جس میں گھوڑے پر وار ایک سلطان کو کسی کافر کو تلوار سے قتل کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا''۔

یہ سب باتیں مردوں کی دنیا سے تعلق رکھتی تھیں یاسمین کو ان کو کچھ علم نہ تھا اس کے دل میں تو ایک ننھی سی آرزو تھی اور مبہم سا تصور تھا کہ ایک پروقار اور شاہانہ کروفر رکھنے والا امیر دمشق کی سرخ عبا پہنے بارہ ترک سپاہیوں کو جلو میں لیے ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر کتب فروشوں کی گلی میں آئے گا اور یہ عالی المرتبت شہزادہ پیار بھری نظروں سے اسے دیکھے گا اور اس کے باپ کو قیمتی تحائف دے کر اس سے یاسمین کو اپنے ہمراہ لے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔ پھر وہ اسے دریا کے

کنارے اپنے محل میں رکھے گا جہاں سفید راج ہنس ہوں گے، حریری ملبوسات ہوں گے اور نقرئی ظروف میں چنے ہوئے میٹھے پھل ہوں گے۔ سفید گھوڑے کا یہ سوار اس سے ہمیشہ پر خلوص محبت کرے گا اور اپنی دوسری بیویوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور صرف اسی کے بچوں کو زیادہ پیار کرے گا اور کبھی اس کے ساتھ استہزا اور بدسلوکی نہ کرے گا۔

''رحیم بہت ہنستا ہے'' یاسمین نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''ہاں ٹھیک ہے'' آکر وہ کیوں نہ ہنسے وہ رچے بچے گھرانے میں پیدا ہوا ہے اور بیسیوں نوکر اس کے اشارے پر ادھر ادھر دوڑتے ہیں۔

یاسمین نے اپنے دل میں سوچا کہ پھر وہ ٹھیک رہے گا اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور میں رحی کو سفید گھوڑے والا امیر بنالیا۔ پھر بھی رحیم رحیم ہی رہا۔ اس نے ایک بار اسے تانبے کا ایک پیسہ دیا تھا اور اس نے یہ پیسہ اتنا چمکایا تھا کہ وہ بالکل سونے کا سکہ معلوم ہوتا تھا۔ یاسمین کو تعجب تھا کہ رحیم ہمیشہ ابراہیم کے بیٹے کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔

اس نے بلی کے بچے کو جو کود کر سڑک پر جانا چاہتا تھا روکا اور دل ہی دل میں سوچا کہ ابراہیم کا بیٹا بہت خاموش ہے اور اسکا چہرہ خوفناک حد تک متین ہے۔ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر اسے دوسرے لڑکے نے کبھی اس سے نظریں بھی تو چار نہیں کیں۔ عبا اس کے چوڑے شانوں پر بے پروائی سے پڑی رہتی ہے اور عمامہ اس کے سر پر بڑی بے ترتیبی سے بندھا ہوتا ہے جیسے اسے اپنے لباس کی کوئی فکر ہی

نہیں۔ وہ گدھوں کے ریوڑ کو چیرتا پھاڑتا اور اونٹوں کی گردنوں کے نیچے سے گزرتا ہوا اس تیزی سے راستہ طے کرتا جیسے کوئی چیز اسے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ جب وہ اس کے باپ کی دکان پر آتا تو بڑے انہماک سے یکے بعد دیگرے کتابیں پڑھتا رہتا ہے اور رحیم اور اس کا باپ باتیں کرتے رہتے ہیں۔

یاسمین کا باپ بڑبڑایا ''ابراہیم کا بیٹا؟ سنا ہے وہ مدرسے میں خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ حجتیں کرتا ہے مسخرا پن کرتا ہے۔ واللہ ان باتوں کا انجام کبھی اچھا نہیں نکلا''۔

یاسمین مسخرے پن سے خوب واقف تھی۔ زنان خانے میں وہ خود بھی اس کی مشق کرتی رہتی تھی۔ لیکن جس دن اس کی بلی کے بچے پر لڑکوں نے پتھر برسائے تھے اسے ایک اور بات سوجھی پڑی۔

بلی کا بچہ باہر نکل گیا تھا۔ یاسمین ملکی ملکی کہہ کر اسے دیر تک پکارتی رہی لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ بالآخر اس نے دیکھا کہ وہ گلی کے موڑ پر چنار کی شاخوں میں چھپا ہوا ہے۔ ملکی اس پیڑ سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ کیونکہ وہ مجبور تھا۔ پانچ چھ طالب علم اس پر پتھر برسا رہے تھے۔ پہلے تو وہ یونہی اوپر پتھر پھینکتے رہے۔ لیکن جوں جوں ان کے دل میں اسے جان سے مارنے کی خواہش بڑھنے لگی وہ اس پر شدت سے پتھراؤ کرنے لگے۔

''ٹھہرو!''۔ یاسمین لرزتی ہوئی آواز میں زور سے چلائی۔ طالب علم پھر بھی نہ مانے اور یاسمین سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ادھر ملکی بے بسی کے عالم میں

شاخوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ یاسمین لڑکوں کو ہٹاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مایوسانہ انداز سے وہ درخت پر جھپٹی اور شاخوں سے لپٹ کر اوپر چڑھنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

جب تک وہ بلی کے بچے تک نہ پہنچ گئی درخت پر چڑھتی ہی چلی گئی اور جب اس نے بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا تو پتھر برسنے بھی بند ہو گئے۔ لڑکوں کی دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ اپنے اپنے رستے پر ہو لیے۔

اب یاسمین اوپر سے نیچے کی شاخوں پر اتری تو اسے ڈر لگا۔ وہ زمین سے بہت بلندی پر تھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی بلندی پر وہ کیسے چڑھ گئی تھی۔ بچے کو گود میں لے کر وہاں سے کود جانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ دکان دار نماز پڑھنے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ اور کوئی بھی درخت پر بیٹھی ہوئی بچی کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اتنے میں ایک لڑکا آیا اور پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر اس نے سنجیدگی سے کہا "کود جاؤ"۔

یہ ابراہیم کا بیٹا تھا اور یاسمین اس کی مدد سے اترنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سر ہلا کر کہا "نہیں"۔

"لڑکی" کہہ کر وہ اچھلا شاخیں پکڑ کر جست لگائی اور یاسمین کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے یاسمین کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور نیچے کود گیا۔ یاسمین ہانپ رہی تھی اور بلی کا بھورا بچہ عمر کے عمامے سے چمٹا ہوا میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ اب وہ زمین پر تھے یاسمین کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ابراہیم کا بیٹا بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی سیاہ

آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ ملکی کو اپنے عمامے سے چھڑاتے ہوئے بولا یا اللہ تم دونوں کی گرفت کتنی سخت ہے!

یاسمین اپنے رخساروں کو پونچھتے ہوئے بولی ''میرا مذاق نہ اڑاؤ''۔ پھر وہ کچھ سٹ پٹائی گئی اور بھاگ کر پھیلی ہوئی بیلوں کے سائے میں چلی گئی۔ تمام رات وہ ابراہیم کے بیٹے کی مسکراتی ہوئی آنکھوں اور مچلتے ہوئے بازوؤں کے سوا کچھ نہ سوچ سکی۔

اس دن کے بعد سے یاسمین ابراہیم کے بیٹے کے سوا، کسی اور چیز کے متعلق نہ سوچتی۔ اب وہ ان سواروں کو بھی نہ دیکھتی جو گلی کے موڑ پر باغیچے کے پاس سے گزرا کرتے تھے۔ بلکہ ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے مسجد کے مکتب کا دروازہ نظر آتا تھا۔ اور جب وہ بے ہنگم لڑکا دوسرے لڑکوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مکتب سے آتا تو یاسمین وہاں سے بھاگ جاتی اور اسکا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو جاتا، لیکن پھر بھی وہ کنکھیوں سے اسے دیکھتی رہتی۔ پہلی بار یاسمین نے یہ محسوس کیا کہ وہ لڑکا سرو قد ہے اور ہموار پتھروں پر اپنے قدم مضبوطی سے رکھتا ہوا چلتا ہے۔ اسکے ہونٹ موٹے اور گہرے رنگ کے ہیں جب وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہے تو اس کے سانولے چہرے پر ملائمت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

یاسمین نے طرح طرح سے اس لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی بہن کا غازہ اپنے چہرے پر لگایا اور آنکھوں میں سرمہ بھی؟ پھر ایک دن چنبیلی کے پھولوں کا ہار گوندھا اور جس طرح اس کی بہن نے کسی نوجوان کو

دیکھ کر ہار گرایا تھا اسی طرح اس نے بھی ٹھیک اوقت جب عمر دکان پر آیا یہ ہار گرا دیا۔ اس نے ہار اٹھالیا اور جیب میں رکھ کر چل دیا..... اور یاسمین پورے ایک گھنٹے تک ہر شخص کی نگاہوں سے چھپتی رہی۔ کیونکہ اسے یہ سوچ کر شرم محسوس ہو رہی تھی کہ وہ پیش قدمی کرنے میں بہت آگے بڑھ گئی تھی۔

پھر اس نے اپنی ماں کے آئینے میں بغور اپنا چہرہ دیکھا اور خود کو حسین محسوس کیا۔ اپنے تصور میں اس نے اپنے تئیں ایک پردہ دار حسینہ بنالیا جس کے چہرے پر پورا نقاب پڑا ہوا ہے اور وہ کسی امیر زادی کے مانند لوگ اسے حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ رات کے وقت اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اپنے دل کی سب باتیں بلی کے بچے کو بتائیں۔ گھر کی عورتوں کو تو یہ خیال ہوا ہوگا کہ یاسمین سو رہی ہے لیکن وہ جاگ رہی تھی اور اس کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لے رہی تھی کہ کاش ابراہیم کا بیٹا اس لمحے اس سے باتیں کرتا۔

جب وہ دکان پر آتا تو یاسمین اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتی۔ کس طرح وہ دھوپ میں چٹائی کے ایک کونے پر بیٹھ کر پڑھتا۔ کن کتابوں کو وہ پسند کرتا ہے۔ او کتاب پڑھتے وقت بعض اوقات کس طرح پیچ و تاب کھا کر اپنی انگلیوں کو مروڑتا ہے۔ ان سب باتوں کو یاسمین بغور دیکھتی۔ ایک کتاب اسے بہت پسند تھی۔ جب ایک مرتبہ یاسمین دکان میں اکیلی تھی تو اس نے اس کتاب کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ اس میں بہت سی تصویریں ہیں جن میں دائرے لکیریں اور عجیب عجیب شکلوں کے مستطیل اور ان کے ٹکڑے بنے ہوئے ہیں یاسمین اس کتاب کو پڑھ تو نہ سکی لیکن

پہچانتی خوب تھی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے یہ کتاب بڑے مخطوطوں میں چھپا دی۔ جب ابراہیم کا بیٹا رحیم کے ساتھ دکان پر آیا تو وہ دراز قد طالب علم کو دیکھ کر مسکرائی۔ اور دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رحیم بولا ''یاسمین! ماہ نو اور جنت کی کسی حور کی کیا مجال کہ تیرے حسن کے مقابل آئے۔'' یاسمین کو یہ جملہ بہت حسین محسوس ہوا۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور پھر یک لخت اس انداز سے اٹھائیں کہ رحیم انہیں دیکھ کر پسند کرے۔

''یاسمین دیکھو میرے پاس کوئی ڈھال نہیں ہے کہ میں تمہارے تیر نیم کش کا مقابلہ کر سکوں للہ رحم کرو'' رحیم مسکرا کر بولا۔

یاسمین بھی مسکرائی لیکن اس کا دھیان ابراہیم کے بیٹے کی طرف تھا جو اس کتاب کو تلاش کر رہا تھا یاسمین نے اس انداز سے جیسے جانے بوجھے ایسا ہوا ہو مخطوطوں کے ڈھیر کو گرا دیا اور تصویروں والی سرخ کتاب اس میں سے نکال لی۔ کتاب نکالتے وقت اس نے کتاب کا ایک صفحہ پھاڑ دیا۔ ٹھیک اس وقت یاسمین کو اپنے باپ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ابراہیم نے کتاب کا صفحہ پھٹتے نہیں دیکھا تھا اور یاسمین کا دل درد سے تڑپ گیا جو اسے یہ خیال آیا کہ ابراہیم کے بیٹے کو یہ کتاب سب سے زیادہ پسند تھی۔ لیکن اس نے پھٹے ہوئے صفحے کو جو کنارہ باہر نکل رہا تھا دیکھ ہی لیا۔ فوراً اس نے یاسمین کے باپ سے کہا کہ ''یہ صفحہ میں نے پھاڑا ہے اب میں اسے خریدوں گا۔ اس کی قیمت کیا ہے؟''

یاسمین کے باپ نے متعجب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا ''یہ اقلیدس

جس میں تمام شکلیں بنی ہوئی ہیں؟'' یہ ایک قیمتی نسخہ تھا بوڑھا کتاب فروش اور رحیم دونوں جانتے تھے کہ ابراہیم کے بیٹے کے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ یہ کتاب خرید سکے۔ یاسمین کے باپ نے کہا ''نیشاپور کے مدرسے کے کتب خانے میں بھی اقلیدس کا کوئی ایسا نسخہ نہیں جس میں تمام شکلیں ہوں'' رحیم نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''اچھا اسے میں خرید لوں گا۔ کیونکہ ابراہیم خیال کے اس لاابالی بیٹے عمر کو میں یہ کتاب تحفے میں دینا چاہتا ہوں''۔

عمر شرما گیا اور اس نے کتاب اپنے مضبوط ہاتھوں میں اٹھالی۔ رحیم ہنستے ہوئے بولا ''لیکن پرانی کتابیں بیچنے والے بزرگ للہ یہ نہ کہنا کہ یہ کتاب سلطان محمود کی ملکیت تھی اور اسے وہ ہمیشہ اپنے سنہرے تخت کے پاس رکھتا تھا۔ یہ کتاب چودہ دینار سے زیادہ کی ہیں کیونکہ یہ ایک کافر یونانی کی لکھی ہوئی ہے جسے مرے ہوئے عرصہ گزرا۔''

یاسمین کے باپ نے جواب دیا ''نہیں جناب'' بوڑھے نے بھاؤ تاؤ کرنا شروع کیا صرف کتاب بغیر شکلوں کے اس سے دوگنی قیمت کی ہے اور پھر اس کی یہ جلد.....''

ایک گھنٹے تک وہ قیمت پر بحث کرتے رہے اور یاسمین اشتیاق سے ان کی گفتگو سنتی رہی اسے یہ معلوم تھا کہ عمر اس کتاب کو حاصل کرنے کا کتنا خواہش مند ہے۔ بالآخر رحیم نے یہ کتاب انیس دینار اور کچھ تانبے کے سکوں کے عوض خرید لی۔ اس کے بعد پھٹے ہوئے صفحے کا کوئی ذکر نہ ہوا۔ جب دونوں طالب علم دوکان سے چل

دیے تو یامین نے دیکھا کہ عمر نے چلتے چلتے ذرا ٹھہر کر اس نے اپنی جیب سے ایک قلمدان نکالا جس پر بہت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ قلمدان اس نے زبردستی رحیم کے ہاتھ میں دے دیا اور واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے بھاگ گیا۔

وہ شام ابراہیم خیام کے بیٹے کے لیے ایک یادگار شام تھی۔ اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور چشمے پر سے اپنے ہاتھ دھو کر بڑی احتیاط سے بھیڑ کی کھال کے تولیے سے انہیں پونچھا اور اس نے مزید ایک چراغ کا بندوبست کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ خام کمرہ مکان کی چھت پر واقع تھا۔ اسے پیاز سکھانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ عمر نے اسے معمولی کرائے پر لے رکھا تھا یہاں وہ رات کی تنہائی میں ستاروں کا نہایت اطمینان سے مطالعہ کر سکتا تھا۔ جب رات کے وقت میدان میں ہوا چلتی تو سوکھی گھاس اور پیاز کے چھلکوں سے ایسی آواز آتی کہ جیسے وہ زندہ ہو گئے ہوں۔ یہاں عمر اپنے بستر پر لیٹ کر مکانوں کی چھتوں اور قصر سلطانی کے مدد و گنبد کو دیکھ سکتا تھا۔

اس رات ہوا کچھ ایسی تیز نہ تھی۔ عمر نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہے اور دوسرا چراغ بھی روشن کر لیا دونوں چراغ دیوار کے طاق میں رکھ دیے اقلیدس کے نسخے کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ اس کے صفحے پلٹنے لگا۔ مکتب میں طوطے کی طرح سبق رٹنے کے مقابلے میں اسے یوں مطالعہ کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

اس نے ابرو جن میں ایک مردانہ حسن تھا۔ سمٹ گئے آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہو گئی۔ اور اس نے قلم دوات اور روئی کے کاغذ کا ایک ورق لیا۔ جس پر

سے سال ہا سال پہلے کی ایک تحریر کو اس نے مٹا دیا تھا۔ پھر پیمانے اور پرکار کی مدد سے اس نے کاغذ پر ایک گاؤدم شکل بنا کر اس کے ٹکڑے کیے۔ اس کا دماغ حساب لگانے میں مشغول تھا انگلیاں شمار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ اپنے کام میں اتنا غرق تھا کہ کمرہ چراغ بلکہ کتاب کی شکل بھی اس کے ذہن سے محو ہو گئی..... پھر ایک لمحے کے لیے کسی جانی بوجھی آواز نے اس کی محویت میں خلل ڈال دیا۔

یہ عشاء کی اذان کی آواز تھی لڑکے نے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ اسے نماز پڑھنی چاہیے۔ اس نے چراغوں کو گل کر کے ایک نیا سوال حل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

آدھی رات کے قریب پھر اس کے انہماک میں خلل پڑا نیچے گلی میں اسے چلنے پھرنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مشعلوں کی روشنی نظر آئی اور ایک کرخت آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کر منڈیر تک گیا اور دیکھا کہ ایک دبلا پتلا شخص سر پر سیاہ عمامہ باندھے مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے ''مومنو'' یہ کہہ کر اس شخص نے اپنے بازو پھیلائے عمر پہچان گیا کہ یہ کوئی ''حنبلی'' ہے۔ ''مومنو بہت قریب ہے وہ دن جب تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے عیش و آرام میں زندگی گزاری ہے ایک تنبیہ کرنے والا آئے گا۔ وہ دن آ رہا ہے جب تمہیں کافروں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑے گی۔ اور جب وہ دن آن پہنچے گا تو تمہیں آرام دہ بستروں سے اٹھانے کے لیے ڈھول پیٹا جائے گا۔ کہ تم تلواریں سونت کر کافروں کو اس طرح مار بھگاؤ گے جیسے تیز ہوا ریت کو اڑا دیتی ہے۔ اس تنبیہ پر غور کرو!''

شکستہ حال حنبلی اپنا سینہ کوٹ کوٹ کر اپنی آواز کے تیر رات کی تاریکی میں پھینکتا رہا۔ بیکار لوگ آپس میں گپ لڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے عمر نے اس کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سنی کیوں کہ وہ شخص بڑا خوش تقریر تھا۔ لیکن جنگ! کیا سلطان ہمیشہ جنگ میں مصروف رہتا تھا؟

جب حنبلی آگے بڑھ گیا اور مومنو کی صدا مکانوں کی چھتوں سے بلند ہونے والی آوازوں میں مدغم ہوگئی تو عمر نے سر اٹھا کر ستاروں کی ترتیب پر نظر ڈالی۔ یکا یک اسے جماہیاں آنے لگیں۔ انگڑائی لیتے ہوئے اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیے۔ اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا مل شانوں تک اوڑھتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہوگیا۔ ابھی ایک ہی لمحہ گزرا تھا کہ وہ بے خبر ہوگیا۔

اتفاق سے یاسمین کو وہ موقع مل گیا جس کی اسے تمنا تھی۔ اس کی ماں نے چشمے سے ایک گھڑا پانی لانے کے لیے اسے بھیجا۔ چنار کے درخت کے نیچے چشمے تک خالی گھڑا لے جانا تو بہت آسان تھا مگر جب گھڑا بھر گیا تو یاسمین اپنے چھوٹے سے سر پر گھڑا رکھ اٹھا کر رکھنے کی کوشش سے کسمساتی رہی۔ اسی دوران عمر وہاں آنکلا اور چشمے پر جھک کر اس نے اوک سے پانی پیا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ وہ اپنے کسی دوست سے حجت میں بھی مصروف نہ تھا۔ اس نے سنجیدگی سے یاسمین کو سلام کیا۔ اس سے پہلے کہ عمر آگے بڑھے۔

'ارے کچھ بات کرو'' بے ساختہ یاسمین کی زبان سے نکلا۔

''میں کیا بات کروں''۔

یاسمین ڈری کہ کہیں عمر چلا نہ جائے ''میرے ابا جان کہتے ہیں کہ تم بڑے ظریف ہو۔تم کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے کے درپے ہو؟''

عمر نے یاسمین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی طوطی ہے جسے یک بیک گویائی مل گئی ہو۔

''یہ کہیں بہتر ہے'' اس نے جلدی سے کہا کہ ''تم لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرو ان کا مذاق نہ اڑاؤ۔وہ کبھی کبھی قند کھلائیں گے۔

اچھا بتاؤ تم کتنے بڑے ہو۔جب تم مدرسے سے باہر ہوتے ہو یا کچھ سوچتے وچتے نہیں یا رحیم کے پاس نہیں بیٹھے ہوتے۔تو اس وقت تم کیا کرتے ہو؟''

''جی'' عمر نے مسکراتے ہوئے کہا ''میں سترہ سال کا ہوں۔کبھی کبھی اپنے ابا کی دکان پر چلا جاتا ہوں جو خیموں کا بیوپار کرتے ہیں۔ان کا انتقال ہو گیا ہے۔لیکن رحیم۔رحیم تو جا رہا ہے''۔

یاسمین کا دل شوق میں چٹکیاں لینے لگا۔شرماتے ہوئے اس نے لڑکے کی طرف دیکھا اور ذرا کھسک کر پتھر پر اپنے پہلو میں اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کی

''اچھا یہ بتاؤ'' اس نے بڑے بیتابانہ انداز میں کہا ''تم کیا کام کرنا جانتے ہو؟''

''اور تم کیا سوچتی رہتی ہو۔جب بچے نہیں کھلاتیں۔پانی نہیں بھرتیں یا جب کپڑے نہیں دھوتیں.....؟''

یاسمین نے بڑی مایوسی سے محسوس کیا کہ ایک طالب علم جو مدرسے میں استادوں سے بحث کرتا ہے۔قرآن کی آیات پڑھتا ہے جو اسے حفظ ہے اور جسے اسی قسم کی اور

بہت سی مصروفیات ہیں۔ بھلا اس غریب سے کیا تعلق۔ لیکن یہ اس کی غلط فہمی ثابت ہوئی کیونکہ عمر اسکے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے سوچ کر کہا ''میں چاہتا ہوں میرے پاس ایک رصد گاہ ہو''۔

یاسمین کو اگرچہ یہ معلوم نہ تھا کہ رصد گاہ کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن وہ کوئی دوسری غلطی کرنا نہیں چاہتی تھی ''اور پھر.....''

''اور اس کے ساتھ افقی گلوب۔ اور بطلیموسی نظام ہئیت کی جدول'' اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک رصد گاہ کی تعمیر کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ یاسمین نے سوچا کہ عمر کو ایک مینارے کی آرزو ہے جو بالکل تنہا ہو۔ جو شاید اس سبزہ زار کی طرح ہوگا جہاں سفید ہنس راج رہتے ہیں اور جو اس کے خوابوں میں بستے ہیں۔

''ہاں ہاں میں جانتی ہوں' اس نے سر ہلا کر کہا ''تم سیدی احمد کی طرح جوتشی بن کر ستاروں کی گردش سے لوگوں کی تقدیریں پڑھنا چاہتے ہو۔''

اس کے گھر کی بڑی بوڑھیاں جوتشی سیدی احمد کو بہت مانتی تھیں۔

.....عمر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس کی بھویں سکڑ کر ایک دوسرے سے مل گئیں اور اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''وہ احمقوں کا باپ ڈھینچو ڈھینچو کرتا ہوا گدھا اپنے اوٹ پٹانگ منتر اور زائچے لیے پھرتا ہے''۔

ایسا معلوم ہوا کہ عمر کو تقدیر کا حال بتانے والوں پر اعتقاد نہیں ہے۔ جو وہ کرنا چاہتا تھا وہ یاسمین کی سمجھ سے باہر تھا۔ عمر کو وقت کا تعین کرنے کے لیے ایک رصد گاہ کی ضرورت تھی۔ یاسمین کے دماغ میں وقت کا تصور طلوع آفتاب سے شروع ہوتا

تھا۔ پھر پانچ وقت کی نمازیں اور ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہو جاتا تھا۔ رہا مہینوں کا شمار تو اس کے لیے ظاہر ہے کہ چاند موجود تھا۔

عمر بہر حال اس سلسلے میں چاند سے مطمئن نہ تھا۔ چاند اپنے راستے پر چلتا رہتا ہے اور سال میں وقت کے کئی گھنٹے شمار کرنے سے چھوڑ دیتا ہے۔ آخر انسان سال میں ان گھنٹوں کا نقصان کیوں کریں۔ اس میں چاند کا قصور تھا لیکن اس کے باوجود گھنٹوں کا صحیح شمار کرنے کی غرض سے لوگوں کو چاند سے قطع تعلق کرنا بھی گوارا نہیں۔

یاسمین نے بڑے دانشمندانہ انداز میں سر ہلایا۔ اس کے دماغ میں اور بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ اگر عمر کو ایسی رصد گاہ میسر آ جائے اور وہ اس سے ذرا بھی محبت کرے تو وہ اس رصد گاہ میں جھاڑو دے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی اس کے جوتوں پر کشیدہ کاری کرے گی۔ اور دونوں رات دن اس رصد گاہ میں ہی رہا کریں گے۔

یاسمین ابھی گھر واپس جانا نہ چاہتی تھی۔ وہ ابراہیم کے بیٹے کی آواز سے محظوظ ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس کے خوبصورت چہرے کے اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا کہ بغیر عمر کے اس کا وجود خالی خالی محسوس ہوگا۔ محض بیکار۔ اور کبھی دنیا کی کوئی چیز اسے خوش نہ کر سکے گی۔ وہ کھسک کر اس کے اور قریب آ گئی۔ اس نے گلاب کے پھول کو زور سے مٹی میں دبا لیا جو اس نے اپنے بالوں میں لگانے کے لیے توڑا تھا۔

''تمہیں یہ پسند ہے؟'' یاسمین نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ اس وقت عمر خیام

چاند کے نا قابل معافی جرم پر بحث ختم کر چکا تھا۔

''کیا اوہ یہ کیوں.....'' اس نے پھول اپنی انگلیوں میں لے لیا اور اسے سونگھا

''کیا یہ تمہارا ہے؟''

''میں چاہتی ہوں تم یہ قبول کرلو'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا ''اور اسے اپنے پاس رکھو''۔

(ایک مرتبہ اس کی بہن نے بھی اسی طرح ایک پھول جھروکے سے نیچے پھینکا تھا اور یاسمین نے دیکھا تھا کہ بغداد کے ایک نوجوان نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا تھا)۔ ابراہیم کے بیٹے نے اس پھول کو محض دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا دماغ ابھی تک چاند کے ساتھ بھٹک رہا تھا۔ یاسمین نے ایک مرتبہ پھر عمر کو اس زمین کی اور خود اپنی جانب واپس لانے کی کوشش کی۔

''جب تمہیں اپنی رصد گاہ حاصل ہو جائے گی.....'' یاسمین نے سوچا کہ وہ رصد گاہ قلعہ کے برج کی سی ہوگی ''تو میں..... بہت خوش ہوں گی''۔

عمر یہ سن کر مسکرایا ''یاسمین بھلا تمہاری عمر کیا ہوگی''؟

''یہی کوئی تیرہ برس'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اس نے اپنی ماں اور دوسری شادی شدہ عورتوں کو کہتے سنا تھا کہ جب لڑکی تیرہ برس کی ہو جائے تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔

''جب تم پورے تیرہ سال کی ہو جاؤ گی تو میں تمہارے لیے گلاب کے پھول بھیجوں گا بہت سارے''۔

وہ وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ اسے اس بات پر بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ دھاری دار کپڑوں میں ملبوس اور بھوکی آنکھوں سے تکنے والی بچی سے وہ کتنی دیر تک باتیں کرتا رہا لیکن یاسمین جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں جذبات سے معمور تھیں۔ مسرت سے اس کے تمام جسم میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ اس نے گدھوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنی اور لوگوں کی آوازیں بھی جو اسے دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ساری گلی اسے کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئے اور آنے جانے والے تمام مرد اجنبی سے دکھائی دیئے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اب یہ تمام کائنات کبھی اپنی عام حالت پر واپس نہ آئے گی..... چشمے کے کنارے اتنی دیر تک بیٹھے رہنے پر جب اسے گھر کی عورتوں نے تھپڑ مارے تو اس نے اس بات کا بھی خیال نہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر وہ بھاگی ہوئی باہر آ گئی اسی جھاڑی سے گلاب کا ایک پھول توڑا اور اسی رات بلی کے بھورے بچے کو اٹھا کر اپنے بچھونے پر آ کر لیٹ گئی۔

''اب وقت آ گیا ہے'' دوسرے دن گھر کی عورتوں میں سے کسی نے تجویز کیا ''یاسمین کو نقاب پہنانی چاہیے اور چار دیواری میں رکھنا چاہیے۔ خدا کی پناہ..... لوگوں نے اسے چشمے کے کنارے گھنٹہ بھر ایک بے ریش طالب علم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا ہے''۔

''آئندہ وہ دکان میں کام نہیں کرے گی'' اس کی ماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ یاسمین خاموش رہی آخر ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ بہر حال اب وہ شادی کے

قابل عورتوں کی طرح نقاب تو پہنا کرے گی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ دیواروں اور چلمنوں کی ظاہری حدیں اس کی محبت کو مقید نہیں رکھ سکتیں۔

لیکن عمر کہیں باہر چلا گیا۔

شاہراہ خراسان پر پہاڑیوں میں ایک سرائے باربردار اونٹوں کے کاروان کے لیے نیشاپور کے مغربی علاقے تک تین ہفتے کا سفر

آدھی رات تک کوئی سو نہ سکا اور سو ہی کیسے سکتا تھا۔ کھلے ہوئے صحن میں آگ روشن تھی جس میں خاردار جھاڑیاں جل جل کر چیخ رہی تھیں۔ اونٹ بیٹھے بیٹھے بلبلا رہے تھے۔ سرائے کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہوئے گھوڑے سوکھی گھاس زور زور سے چبا رہے تھے اور اس پر طرہ ی کہ گداگر اپنے ہاتھوں میں کشکول اٹھائے مسلسل یاہو یا حق کی صدائیں لگاتے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

لوگ خالی دیگچیوں کے اردگرد بیٹھے اپنی انگلیاں چاٹ رہے تھے۔ جو کھانے کے بعد چاول اور چکنائی سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ذرا رک کر کبھی کبھی خشک میوے یا تانبے کے سکے وہ گداگروں کے کشکولوں میں بھی ڈال دیتے تھے۔ ان کے دلوں میں خیرات کا جذبہ اس لیے کارفرما تھا کہ وہ سفر کر رہے تھے۔ اور سفر میں کیا پرخطر سفر! خیرات کرنا تو ویسے بھی ثواب کا کام ہے۔

سرائے کا مالک چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ پانی کا ایک ایک قطرہ ختم ہو چکا ہے وہ موسی تو ہے نہیں وہ ایسی حالت میں پانی کہیں سے پیدا کر دے۔ اور اس دوران میں

وہ بڑی چالاکی سے اپنے کیسے میں رقم کا شمار بھی کرتا جاتا تھا۔ شاہراہ خراسان پر سرائے میں ان دنوں بڑی گہما گہمی تھی۔ حتیٰ کہ وسط سرما میں بھی روزانہ سینکڑوں آدمی ادھر ادھر سے گزر رہے تھے۔ اور سب کے سب فوج میں شامل ہونے کے لیے مغرب کی سمت سفر کر رہے تھے۔

سرائے کے کشادہ صحن کے چاروں طرف مسقف دالان بنے تھے ان دالانوں میں لوگوں نے قدم قدم پر بھیڑ کی کھالیں بچھا رکھی تھیں۔ کچھ نے انگیٹھیوں میں کوئلوں کی آگ روشن کر رکھی تھی جس کی روشنی میں ان کے باریش چہروں کی جھریاں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ خراسانی ایرانی اور عرب قاقم و سنجاب کے دہرے لبادے پہنے مسکرا مسکرا کر شگفتہ انداز میں بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی یخ کر دینے والی ہواؤں میں سفر کرنے کے بعد انہیں یہ آرام بہت خوش گوار محسوس ہو رہا تھا۔ صرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والے سپاٹ ترکی چہرے احساس سے خالی نظر آتے تھے۔ وسط ایشیاء کے لق و دق صحرا سے آنے والے ان جفاکش سواروں کے لیے سردی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ جنگ اور آوارہ گردی کے عادی تھے اور بہت ہی کم باتیں کرتے تھے۔

نیشاپور کے زمیندار کے بیٹے رحیم زادہ کے پاس اتفاق سے ایک انگیٹھی تھی۔ وہ سمور کے استر کا ایک نفیس خلعت پہنے انگیٹھی کی گرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ایک رات جب وہ دروازہ بند کر کے شراب پی رہا تھا تو اس وقت ایک پرجوش جنبلی کی صدا اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اس صدا کو اپنے لیے ایک تنبیہ

تصور کیا تھا۔ رحم علاوہ کھیل تماشوں کے موقعوں کے عموماً بڑا کاہل واقع ہوا تھا۔ لیکن اس تنبیہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے اس جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے چاہئیں اور اسی جذبہ کے تحت وہ اپنے رضائی بھائی عمر خیام اور ایک مسلح دستے کے ساتھ مغرب بعید میں سلطان الپ ارسلان کی ٹڈی دل فوج میں شامل ہونے کے لیے چل پڑا تھا۔

''بہر حال'' اس نے کہا ''میدان ایک ہرن کا تعاقب کرنے کے مقابلے میں تو زیادہ جذبات انگیز ہوگا''۔

رحیم قدیم ایرانی شرفا کی نسل سے تھا۔ وہ ایرانی شرفا جو یونانیوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ وہ بڑا نفیس مزاج کا انسان تھا۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں پینے کا دلدادہ۔ اسے چوسر اور چوگان کھیلنے کا بڑا شوق تھا مگر وہ ان سے بہت جلد اکتا بھی جاتا تھا۔

''بخدا'' اس کا ایک ساتھی بڑبڑایا ''کیا کڑاکے کی سردی ہے''۔

رحیم نے جماہی لی۔ واقعی سردی تیز تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بستر والی کھال میں کچھ کھٹمل بھی گھس آئے تھے۔ اتنے میں سرائے کا مالک اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور جانے کا نام نہ لیا تو رحیم نے اسے سر اٹھا کر دیکھا۔

''عالی مرتبت نوجوان امیر کو ناگوار نہ گزرے تو عرض کروں'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا ''سرائے کی پشت کے مکان میں کچھ مسافر عورتیں مقیم ہیں''۔

عالی مرتبت نوجوان امیر نے کسی ناگواری کا اظہار نہ کیا تو سرائے کے مالک نے جھک کر کہا ''کچھ لڑکیاں بغداد سے آئی ہیں بڑی خوش مذاق اور تربیت یافتہ ہیں''

اس نے اس افسانہ طرازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہ اس مکان کے مکین مسافر ہیں۔ رحیم سے صاف صاف کہا ''اگر تیغ زنوں کے امیر کو تفریح کی ضرورت ہو.....''

رحیم قدرے ہچکچایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ ''ابراہیم کے بیٹے سے کہو'' اس نے اپنے ملازم کو حکم دیا ''کہ میں جا رہا ہوں تھوڑی دیر کے لیے کچھ اپنے دوستوں سے باتیں کرنے''

''بسر و چشم' بڑے ادب سے اس شخص نے کہا۔

جب رحیم سرائے کے مالک کے پیچھے پیچھے زینے کی طرف بڑھا تو تیغ زنوں ن بڑے رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انگیٹھی پر ہاتھ تاپتے ہوئے سو گئے۔

خاصی دیر بعد رحیم واپس آیا۔ مردوں کی طرح سوتے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا۔ وہ تھکا ماندہ اور پژمردہ تھا۔ خدا کرے سرائے کے مالک کی سات پشتیں دوزخ کی آگ میں جلیں۔ رحیم بڑبڑایا۔ ''خدا کرے وہ غلاظت کھائیں'' وہ دھڑام سے بستر پر گر گیا۔ مگر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عمر جاگ رہا تھا۔ اس نے شکایتاً کہا ''تو کہاں غائب ہو گیا تھا''۔

''یوں ہی گھوم رہا تھا اف اس شاہراہ پر کیا گہما گہمی ہے''۔

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شاہراہوں کے مناظر اور ان سے بھی زیادہ ریگستانی سڑکیں اس کے اندر ایک ولولہ پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ خود ریگستان میں پیدا ہوا تھا اور اس کی رگوں کے میں عرب خانہ بدوشوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس طرف ایک بڑی خیمہ گاہ ہے اور اس خیمہ گاہ میں اتنا بڑا خیمہ ہے جیسے نیشاپور کا چھوٹا قلعہ

وہاں ترک ہی ترک بھرے ہوئے ہیں مسلح سونے کے خود پہنے۔ میں ان کی گفتگو تھوڑی تھوڑی سمجھتا ہوں۔ وہاں آج رات کو کوئی شہزادہ ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اسے خود دیکھ کر آرہا ہوں۔

رحیم نے ایک گہرا سانس لیا عمر کا یہ عمل اس کی شدت جذبات ہر بات میں دخل اندازی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کے خیال کے تحت تھا۔ ابراہیم کے بیٹے کے لیے جنگ بالکل نئی چیز تھی۔ حتی کہ وہ اپنی حد سے باہر اجنبی گھڑسواروں کو دیکھنے بھی گیا۔ پڑاؤ کے بعض حصوں میں جا کر اس نے لوگوں سے سوالات بھی کیے۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اونٹوں سے اتارے ہوئے مال کا جائزہ تک لے ڈالا۔ دریا کو تیر کر عبور کرنے میں عمر کو بڑا مزہ آیا۔ برخلاف اس کے رحیم دریا پار کرنے میں بھیگ کر چوڑا ہو گیا۔ کسے دیکھا ہے؟ رحیم نے عمر سے پوچھا۔

''میں کچھ سن نہیں سکا۔ وہ اپنے خیمے میں آگ کے قریب ایک سرخ حاجم پر بیٹھا ہوا تھا اور حکاء سے بات چیت کر رہا تھا جو شاید اس کے استاد تھے۔ وہ تجھ میں عمر میں کوئی دو سال چھوٹا ہو گا۔ وہ دھاری داری سمور کا سنتان پہنے تھا۔ حکیم اور عالم اس سے کہہ رہے تھے کہ جو ستارہ اس نے دیکھا تھا وہ سہیل تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات غلط تھی۔ اس مقام سے اس وقت سہیل کسی کو نظر نہیں آسکتا''۔

''ارے یہ تو میں بھی جانتا ہوں'' رحیم نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا ''وہ کیا ضرب المثل ہے.....''

کہ ''سہیل دیکھنا خوش نصیبی کی نشانی ہے..... ہاں''

''ترکوں کے سامنے بولنے کی تو نے جرات کی؟ آخر کس طرح''؟

''میں نے عربی میں بات چیت کی'' عمر نے شگفتہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ''وہ ترخان بچہ ستاروں کا جھمکا (عقد ثریا) دیکھنے کے لیے میرے ساتھ خیمے سے باہر تک آیا۔ وہ سب عالم بے وقوف تھے اور بے وقوفی کی باتیں کر رہے تھے.....''

''نہیں نہیں تو بڑا غیر ذمہ دار ہے۔ تو نے انہیں جھٹلا کے بیوقوفی کی۔ تیری سمجھ میں یہ بات کب آئے گی کہ اس شخص کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولنی چاہیے جو تیرے منہ پر جوتا مار سکتا ہے'' رحیم کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ ڈر بھی لگا۔

''شہزادے نے کیا کہا؟''

''اس نے پوچھا کہ کیا یہ ستارے جنگ کے متعلق کوئی نشاندہی کرتے ہیں؟''

''بیشک کرتے ہیں''۔

نوجوان طالب علم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور خشک زمین پر تلوار میان سے کچھ شکلیں بنانے لگا رحیم اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''تو ہم مع..... ایران کے قدیم پجاری..... سے بھی زیادہ عقل مند تصور کیے جائیں گے۔ اگر ہم انسانی تقدیر پڑھ سکیں۔ اس کے باوجود میں نے اس لڑکے کو دکھایا کہ کو سا ستارہ کس برج میں مقیم ہے.....''

''مجھ سے یہ سب بکواس کرنے کی ضرورت نہیں'' عمر کے دودھ شریک بھائی نے بڑی بے صبری سے چلا کر کہا ''کیا شگون نکلتا ہے؟''

عمر نے اپنا سر ہلایا "زرتشت کی گفتگو کان لگا کر سنو۔ بادشاہ برسر جنگ ہیں۔ اور آسمانوں سے یہ ندا آتی ہے کہ مشرق کے بادشاہ کا مقدر عروج پر ہے اور مغرب کے حکمران کا زوال پذیر ہے۔..... لیکن پیشن گوئی سنو..... موت کا سایہ دونوں پر چھایا ہوا ہے" وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا "یہ سب بے معنی باتیں ہیں لیکن شیر بچے نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے وہ کسی بھوت کو دیکھ رہا ہو"۔

"شیر بچہ" رحیم کی آنکھیں جیسے پھٹ گئیں "کیا کہا.....؟"

"وہی شہزادہ جو سفید کفتان پہنے تھا سب لوگ بہر حال اسے اسی نام سے مخاطب کر رہے تھے"۔

"بریش پدرم" رحیم نے گہرا سانس لیا "تو نے اس سے پہلے کبھی شیر بچے کا نام نہیں سنا تھا؟"

"نہیں"۔

"خدائے رحمان و رحیم تیرا ساتھ دے شیر بچہ صرف ایک ہی ہے وہ سلطان الپ ارسلان شیر بہادر کا سب سے بڑا فرزند ہے۔ تو نے شہزادہ وی عہد سے فتح کی پیشن گوئی کی ہے"۔

"میں اسے نہیں جانتا تھا"۔

"مگر اس کا یقین کون کرے گا کہ اس کے علاوہ تو نے اس کے باپ کی موت کی پیشن گوئی بھی کر دی ہے" جو..... رحیم نے مختلف امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا ..... "کوئی سمجھدار نجومی کسی حالت میں مجمع عام میں ایسی پیشن گوئی نہیں کرے گا

تاہم شیر بچے کے لیے صاحب تاج و تخت ہونے کے مترادف ہے۔ اچھا پھر اس نے کیا کہا؟

''اس نے میرا نام پوچھا۔ اور میں نے بتا دیا۔ اس نے پوچھا کہ تم کس کے ملازم ہو میں نے کہا کسی کا بھی نہیں۔ میں تو نیشاپور کے مدرسے کا طالب علم ہوں''

'[ہوں اگر مجھے اپنے ترک آقاؤں کو غلط اندازہ نہیں ہے اور اگر واقعی الب ارسلان مر گیا تو سیدھا اس شیر بچے کی خدمت میں حاضر ہو کر شاہی منجم کا اعزاز طلب کر سکتا ہے۔ اگر تجھے یہ مرتبہ حاصل ہو جائے تو ایک معقول تنخواہ پر مجھے اپنا فراش مقرر کر دینا''۔

عمر نے سر ہلایا۔

'میرا خیال ہے'' رحیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا ''باوجود بے پراوئی کے تو ایک عمدہ جوتشی بن سکتا ہے۔ ہر شخص تیری بات کا اعتبار کرتا ہے'' ''او یرماق.....'' اس نے ایک سوئے ہوئے ملازم کو ٹھوکر ماری۔ یرماق۔ چمڑے کے تھیلے سے صراحی نکال کر لا۔ اور ایک جام بھی''۔

رحیم نے ہاتھ میں جام لیا تو یرماق نے اس میں شراب انڈیل دی۔ شراب جو حرام ہے رحیم جو اس کا دلدادہ تھا سرگوشی کے انداز میں کہا کہ مقدس جنگ لڑ کو جو ثواب عظیم حاصل ہونے والا ہے اکے مقابلے میں اس چھوٹے سے گناہ کی کیا حیثیت ہے۔ عمر نے سنی ان سنی کر دی۔ اسے اپنے دو دھ شریک بھائی سے بڑی محبت تھی۔ وہ خاموش رہا۔

''تاہم'' رحیم نے جیسے ہی جام خالی کیا تو عمر بولا ''مجھے خوف ہے کہ کہیں ہمیں جنگ میں شکست نہ ہو جائے''

''نہیں نہیں ہمیں شکست نہیں ہو سکتی'' رحیم نے بلند آواز سے کہا۔

''بفرض محال ہمارا سلطان ایک معمولی سپاہی ہے لیکن اسے آج تک ہر معرکے میں فتح نصیب ہوئی ہے۔ بہر کیف یہ ایک قابل یقین پیشن گوئی تھی'' خوش ذائقہ شراب سے اس کی طبیعت ذرا سنبھل گئی۔ اس نے دوسرا جام پیا۔ اور تصور کیا کہ جیسے وہ میدان جنگ میں ہے اور سلطان کے سر خ پرچم کے ساتھ ساتھ اپنے قد آور ابلق گھوڑے پر سواری بڑی بے خوفی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں فوجوں کی پہلی صفوں کے درمیان مسیحیوں نے ایک یگانہ روزگار سورما ایک آہن پوش جنگجو سے دست بدست نبرد آزما ہے۔ اس نے تصور ہی تصور میں اپنے تئیں کافر جنگجو کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ مسلمان ہر طرف اس کی تعریف کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس نے اپنے دشمن کا سر اتار کر اپنے سلطان کے گھوڑے کے قدموں میں ڈالنے کا خیال باندھا.....''

''ذرا لینا اسے عمر'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کا دودھ شریک بھائی اپنے اونٹ کے بالوں والے کمبل میں لپٹا ہوا بالکل بے خبر سو رہا تھا جیسے جنگ فتح اور غایات شاہی کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

نیشاپور لیس مغربی کی سمت ایک باربردار اونٹ کی پانچ ہفتے کی مسافت پر دریائے ارسناس کی وادی جو آرمینیا کے پہاڑوں کی نیلی جھیل وان سے نظر آتی ہے 1071ء کے موسم بہار کا آغاز

شاہی مسخرا جعفرک اپنے سفید گدھے پر بیٹھا سوچ رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں گدھے کے پیٹ کے دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ اس کا جسم ایک سرخ چغے میں ڈھکا ہوا تھا۔ صرف اس کی بھوری آنکھیں بے چینی سے جلد جلد گردش کر رہی تھیں۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنے فکرمند آقا سلطان الپ ارسلان کو تنہا چھوڑے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے جو جنگ کرنی ہے وہ کوئی معمولی جگ نہیں ہے۔

لوگوں نے جعفرک سے کہا تھا کہ وہ سامان کے پاس اور مولویوں کے ساتھ بیٹھے کیونکہ ان کی رائے میں یہ انتہاء محفوظ جگہ تھی۔ لیکن جعفرک نے انہیں جواب دیا ''میرے لیے سب سے محفوظ جگہ اپنے سلطان کی رفاقت ہے کیونکہ مسلمان ادھر تیر نہیں پھینکیں گے اور عیسائیوں کے فرشتے بھی کبھی وہاں نہیں پہنچ سکتے.....''

جعفرک کی اس بات سے مخدوم عالمیان فرمانروائے شرق وغرب سلطان الپ ارسلان سلجوقی بہت خوش ہوا چنانچہ جعفرک اس سرخ پرچم اور شاہی چتر کے قریب ہی ڈٹا رہا جو مسلح غلام الپ ارسلان کے سر پر لگائے ہوئے تھے۔ الپ ارسلان نے ان دنوں ہنسنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ جنگ طول کھینچ گئی تھی اور مسلمان فوجوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔

الپ ارسلان نے ملاظ گرد کی شہر پناہ کے قریب اور وادی کے فراز میں اپنا جھنڈا

گاڑ دیا تھا۔ اس کے خیمے کے سامنے وسیع اور زرخیز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی میں ملعون رومیوں کا عیسائی فوجوں کے دل بادل بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کثیر فواج کی کمان قسطنطنیہ کا شہنشاہ خود کر رہا تھا..... وہ شہنشاہ جس کے آباؤ اجداد چار سو سال سے اسلام کے ساتھ سخت دشمنی کرتے چلے آ رہے تھے۔

اس سے قبل الپ ارسلان اس شہنشاہ کی سلطنت میں محض چھاپے مارنے پر اکتفا کرتا رہا تھا اور ایشیائے کوچک کے اہم علاقوں میں جو ایشیا میں سلطنت روما کے مرکزی علاقے تصور کیے جاتے تھے سلطان کے سوار دستے یلغار کرتے تھے' لیکن اب سلطان کے ان حملوں نے رومیوں کو غضب ناک کر دیا تھا اور بالآخر شہنشاہ روم نے اس جنگجو ترک پر جس نے اسے بڑی جرات سے چیلنج کیا تھا اور بآخر شہنشاہ روم نے اس جنگجو ترک پر جس نے اسے بڑی جرات سے چیلنج کیا تھا اور جس کے آباؤ اجداد نے جو تو قاق مانڈر کی اولاد سے تھے وسط ایشیاء کے میدانوں سے نکل کر قریباً قسطنطنیہ تک دھاوے مارتے تھے' جوابی حملہ کے لیے اپنی پوری طاقت کو یکجا کر لیا تھا اب یہ شہنشاہ کثیر التعداد سوار اور پیادہ فوجوں کے ہمراہ بھاڑے کے یلغاری تیر اندازوں' جارجیا کے خوفناک نیزہ بازوں اور ان ارمنی سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا جو اپنے ملک کو مسلمانوں کے حملے سے بچانا چاہتے تھے۔ چیونٹی کی چال بڑھنے والی ٹڈی دل فوجوں میں نسل در نسل کے لوگ تھے۔ یہ ستر ہزار کی فوج وادی میں آہستہ آہستہ اس ترک فوج کا تعاقب کر رہی تھی جس کی تعداد کل پندرہ ہزار تھی۔

عیسائی شہنشاہ جو خود ایک عمدہ سپاہی تھا ان ترک سواروں سے جو اسے مہینوں

سے چکمے دے رہے تھے' دست بدست جنگ کرنے کے لیے بے تاب تھا لیکن اب خود شہنشاہ کے افسروں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سلطان الپ ارسلان نے زمین پر اپنا پرچم گاڑ دیا تھا اور اپنے سوار دستوں کو شہنشاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے وادی میں تعینات کر دیا تھا۔

جعفرک کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ پندرہ ہزار نفوس ایسی صورت میں جنگ کا انتظار کرنے بیٹھے ہیں جبکہ ستر ہزار فوجیں ان کے تعاقب میں ہیں۔

اس نے بعض امیروں کو اس وقت جبکہ ان کے خیال میں ان کی باتیں درباری مسخرے کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا' یہ کہتے سنا تھا کہ رومیوں کے کثیر التعداد نیزہ بازوں کی تاب جنگ آزمودہ ترک سوار نہیں لا سکتے۔ اس نے سوچا کہ پھر بھی الپ ارسلان اپنے سواروں کے لیے جنگ کا منتظر ہے۔ اور عیسائیوں کی فوجیں دلدلوں میں آہستہ آہستہ بڑھتی اور ترک فوجوں کے قریب آتی جا رہی تھیں۔ جعفرک جانتا تھا کہ بہت سے ترک افسر ایک جگہ جم کر لڑنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ انہیں تو حملہ اور تعاقب کرنے یا تیزی سے پسپا ہو جانے کی عادت ہے۔

الپ ارسلان نے اپنی بھاری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا ایسا نہیں ہو گا..... رومیوں کے خیمے وادی کے اس نشیب میں لگ چکے ہیں اور وہ ہمارے تعاقب میں آگے بڑھ آئے ہیں اور ہم یہاں موجود ہیں۔ تقدیر کا فیصلہ لکھا جا چکا ہے اور جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا''۔

جعفرک نے جو بڑے شہزادے کے قریب بیٹھا ہوا تھا دیکھا کہ شہزادے نے سر

اٹھا کر اپنے باپ کی طرف اس طرح نگاہ کی جیسے وہ ان الفاظ سے ڈر گیا ہو۔ درباری مسخرے نے دل میں سوچا کہ شاید کل کی جنگ کے نتیجے کا جیسا کہ مولویوں نے اعلان اور عاقل نجومیوں نے پیشن گوئی کی ہے فیصلہ ہو ہی چکا ہے۔ اس نے اپنے خیال میں عیسائیوں کے عظیم شہنشاہ کا بھیگے ہوئے وسیع و عریض میدان جنگ کا اور ان بے حس سلجوق سواروں کا تصور کیا جو جنگ میں شکست قبول کرنا نہیں چاہتے تھے اس نے غالباً اس جنگ کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے اور کل کی جنگ تصفیہ شدہ بازی کی مانند ہوگی اور ہم نے اس کی بساط پر مہروں کی طرح ادھر ادھر ناچیں گے اور بس۔

لیکن الپ ارسلان رات بھر نہ سویا۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے رحیم اٹھ بیٹھا۔ وہ مارے سردی اور جوش کے کانپ رہا تھا۔ اس نے یارہویں مرتبہ یراق کو اپنی تلوار آب رکھنے کے لیے دی اور دوسرے نوکروں کو اپنا ابلق گھوڑا کسنے کا حکم دیا۔ جلدی جلدی اس نے کچھ کھجوریں اور بھیگے ہوئے جو کھائے۔ اب جنگ کا ہنگام آ پہنچا تھا یہ وقت اس سے قطعی مختلف تھا جو ہرن کا تعاقب شروع کرنے سے پہلے آتا تھا جس کا نقشہ رحیم نے اپنے ذہن میں کھینچا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے طلوع آفتاب کے وقت سوار ہونے کا حکم دیا جاتا اور وہ نعرہ مار کر میدان میں بڑھتا رحیم مجبوراً گھٹنوں اپنے گھوڑے کے قریب بے قرار پھرتا رہا۔ کہر آلود فضا کا وہ دھندلکا جو اسے چھپائے ہوئے تھا۔ آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اور اس کے ملازم آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے پانسے پھینک رہے تھے۔ جب رحیم اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو اسے ان سواروں کے نیزے اور سر نظر آئے جو

آہستہ آہستہ سڑک سے گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی اسے ایسی ہوا کی سنسناہٹ سنائی دیتی جو دور کسی جنگل میں چل رہی ہو اور ایک بار وادی کے اس پار سے اس نے ایک زبردست شور سنا۔ بالکل ایسا شور جیسے کسی لنگر کے دن نیشاپور کی مسجد پر لوگوں کے ہجوم سے ہوتا تھا۔

ایک اجنبی سوار رحیم کے قریب سے گزرا تو اس نے چلا کر اس سے جنگ کا حال پوچھا۔ یہ سوار ایک ترک تھا اور اس نے صرف منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا اور اپنی راہ چلا گیا۔ رحیم بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اپنے دستے کی کمانڈر کے پاس پہنچا۔ وہ ایک امیر تھا جس کے دستے میں نیشاپور کے رضا کار سپاہی شامل تھے۔

رحیم نے بڑے اشتیاق سے امیر سے کہا "ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیجیے ورنہ ہم پہلا حملہ نہ دیکھ سکیں گے" اسے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وادی میں کئی گھنٹے سے جنگ ہو رہی تھی خراسانیوں کو عجیب عجیب خبریں پہنچی تھیں۔ انہوں نے سنا تھا کہ عیسائیوں نے آہن پوشوں دیووں کو مسلمانوں سے لڑنے بھیجا ہے۔ ایک پورا فوجی دستہ دریا میں ڈوب گیا ہے...... سلطان دائیں طرف پہاڑوں میں گھس گیا ہے۔ جارجیا اور آرمینیا کی کثیر التعداد فوجیں اس پر حملہ کر رہی ہیں۔ اور وادی میں میلوں تک عیسائی فوجیں پٹی پڑی ہیں۔

اتنے میں ایک شخص چلایا لیکن غلطیے سامنے دیکھو وہ ہمارا بادشاہ سلطان الپ ارسلان آرہا ہے......"۔

رحیم گھوڑوں کی رکابوں میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان ایک ٹیلے پر سواروں کے دستے کے جلو میں جا رہا ہے۔ اس دستے کے آگے جو سوار ہے وہ ایک سبزے (گھوڑے) پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک لمبا چوڑا اور قوی انسان معلوم ہوتا ہے اس کے سال خوردہ چہرے پر دونوں طرف بل دی ہوئی مونچھیں ہیں اور سر پر بھیڑ کی سیال کھال کی اونچی ٹوپی ہے جس ہاتھ میں لگام ہے اسی میں ہاتھی دانت کی چھڑی ہے اور پہلو میں ترکش بالکل اس انداز سے لٹک رہا ہے جیسے وہ شاہی محافظ دستے کا کوئی تیر انداز ہے۔

افسروں کی طرف دیکھ کر رحیم نے آہستہ سے پوچھا ''سلطان کہاں ہے؟''

''واللہ! وہ سلطان ہی تو ہے جو سب سے آگے ہے'' کسی نے جواب دیا۔ رحیم کو توقع تھی کہ سلطان وہ ہوگا جو گھوڑے پر سرپٹ دوڑاتا اور اپنا ریشمی لباس ہوا میں اڑاتا گزرے گا۔ اس کے زریں خود میں رنگین پر لگے ہوں گے..... ایک پرچم ساتھ ہوگا۔ آگے آگے نقارے بجتے ہوں گے اور نہ معلوم اس کے علاوہ کیا کیا ہوگا۔ جب اسنے ان خاموش معمولی انسانوں کو دیکھا جن کے پیچھے سفید گدھے پر ایک بونا چلا آ رہا تھا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی اور وہ خاموشی سے اپنی جگہ واپس آ گیا۔

دوپہر کے وقت جب وہ بھوکا اور تھکا ہوا تھا تو عمر نے اسے بلا کر کہا ''رحیم ادھر آؤ اب جنگ کے شعلے قریب تر آتے جا رہے ہیں۔ میں ترمانوں کے ساتھ ٹیلے پر سے جنگ کا نقشہ دیکھ رہا تھا''۔

جب وہ اس ٹیلے پر پہنچے جہاں سے سلطان گزر رہا تھا تو رحیم نے ایسی آواز سنی

جیسے ہزار ہا شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ اس کے کانوں میں ہتھیاروں کے ٹکرانے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ سورج کی شعاعوں نے کہر کا پردہ بالکل چاک کر دیا تھا۔ دھوپ سے پوری وادی چمک رہی تھی اور اس کے دامن میں سواروں کی ہزار ہا چھوٹی چھوٹی شکلیں ادھر ادھر دوڑتی نظر آ رہی تھیں بعض اوقات یہ شکلیں چرتے ہوئے مویشیوں کی مانند آہستہ آہستہ آگے بڑھتی اور پھر وہ اس طرح ٹیلے کی طرف پلٹ آتیں جیسے ہوا کی کسی شدید جھونکے نے انہیں دھکیل دیا ہو۔

عمر نے چلا کر کہا ''دیکھو!''

خود ان کے ملازمین کھڑے، خوشی سے ان کی طرف اشارے کر رہے تھے اور خراسانیوں کے دستے نے اسے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

رحیم چیخ کر بولا ''بالآخر اب وہ حملہ کریں گے'' اتنے میں ایک لڑکے نے نیزہ تان کر رحیم کی رکاب پکڑ لی اور چیخا۔

''اللہ! الا اللہ! اسکی پشت میں ایک نیزہ پیوست تھا اور وہ رحیم کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

رحیم کے خیال میں یہ وہی لمحہ تھا جس کا اسے انتظار تھا اس نے اپنی تلوار کھینچ لی لیکن پھر اسے نیام میں رکھ لیا کیونکہ دوسرے لوگوں نے اپنی ڈھالیں سنبھالنے کے علاوہ تلواریں نہیں کھینچی تھیں۔ نیزے والے لڑکے سے جب گھوڑے کے ساتھ بھاگا نہیں گیا تو وہ زمین پر یہ کہتا ہوا گرا ''قبل کر دو۔ قتل کر دو!'' اب یہ سوار جتے ہوئے کھیتوں میں دوڑتے اور نالے پھاندتے آگے بڑھ رہے تھے۔

انہیں وادی کے میدان میں دوڑتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن اب یہاں ان کے گھوڑے مقتول سپاہیوں کے ان جسموں کو دیکھ کر بھڑکتے تھے جو آدھے کیچڑ کے اندر اور آدھے باہر تھے۔ ان کے پاس بہت سے ایسے گھوڑے بھٹکتے پھر رہے تھے جن کے سوار غائب تھے اور عرب قبائل مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھے۔

رحیم نے جو جنگ کے شوق میں بے تاب ہو رہا تھا بے ساختہ کہا "اب یقیناً سلطان ہمیں نبرد آزمائی کے لیے طلب کرے گا" لیکن دشمن سے دوچار ہونے کے بجائے انہیں اپنے سامنے ترک فوج کا ایک دستہ نظر پڑا۔ جو ایک ویران باغ میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ رحیم نے ساتھیوں کو بھی اپنی جگہ سے شب گزاری کا حکم ملا۔ اگرچہ ترکوں کو کہیں سے سوکھی گھاس مل گئی تھیں اور وہ خوب آگ جلا رہے تھے۔ لیکن خراسانیوں کے پاس نہ تو آگ جلانے کے لیے ایندھن تھا اور نہ کھانے پینے کی کوئی چیز۔ صرف تھکن کی وجہ سے ان پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی اور دور میدان میں طبل جنگ کے شور نے انہیں اس غنودگی سے بیدار کر دیا۔

یہ طبل عیسائی فوج کے کیمپ میں بج رہے تھے جہاں روم کا شہنشاہ اپنی فوج کے ہزیمت خوردہ قلب کو لے کر پسپا ہو گیا تھا..... شہنشاہ کی فوج جو عقب میں متعین تھی یا تو کسی غلط فہمی کی بنا پر یا اسے دھوکا دے کر رات کی تاریکی میں فرار ہوئی تھی اور پہاڑوں میں شہنشاہ کے میمنے اور میسرے کی جو پیادہ فوج تھی اس نے الپ ارسلان کے سواروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ لیکن رحیم اور عمر کو اس کا کچھ علم نہ تھا۔

ان کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل تھیں اور جسم زمین کی نمی اور سردی سے اکڑ گئے تھے۔

ملازموں نے ان کے گھوڑوں پر زین کس دی تھی اور اس سے پہلے کہ انہیں صورت حال کا پورا احساس ہو وہ دونوں کثیر التعداد سواروں کے غول میں چیختے اور نعرے لگاتے' اپنے گھوڑوں پر سرپٹ دوڑنے لگے۔

عمر کے ہاتھ باگ پر تھے اور سر میں ایسا درد تھا کہ جیسے بخار ہو گیا ہو۔ اسے اپنے اردگرد کی افراتفری میں محض جزوی مناظر نظر آ رہے تھے۔ کسی سوار کے سر پر پگڑی کا اڑتا ہوا طرہ..... ننگے پاؤں اور منہ پھیلائے دوڑتا ہوا کوئی شخص..... کوئی الٹی ہوئی گاڑی جس کے نیچے کوئی رینگ رہا تھا۔

یکا یک اسے ایک طرف کوئی شخص گھٹنوں کے بل چلتا نظر آیا۔ ایک سوار اسکے پاس پہنچا اور اس زخمی آدمی کے نیزہ مارا۔ نیزے کی انی زرہ سے ٹکرائی اور پھر اس زخمی شخص کے پہلو میں گھستی چلی گئی۔ اس کے منہ سے خون ابلنے لگا۔ اور اس کا سر نیوڑھا گیا' حالانکہ وہ اب بھی رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر نے دل میں سوچا کہ یہ کوئی عیسائی سپاہی ہو گا۔

اس نے اپنا منہ پھیر کر رحیم کی طرف دیکھا۔ ڈھیلی پگڑی والا سوار ایک تیر کو جو اسکے کولہے میں گھسا ہوا تھا پکڑے تھا' عمر نے اس کے کراہنے کی آواز سنی۔ پھر اس نے اپنے دونوں طرف خیمے دیکھے۔ اس کے بعد عمر نے لوہے کی جھنکار اور چیخنے کی آواز سنی۔ اس نے باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ وہ جنگ میں

شریک بھی ہوا لیکن اسے ایک بار بھی تلوار کھینچنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

رحیم ایک بڑے خیمے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے گرد خراسانی سوار اپنے گھوڑوں سے اتر اتر کر مال غنیمت تلاش کر رہے تھے۔ انہیں مال غنیمت لوٹنے کا حکم کسی نے نہ دیا تھا' لیکن وہ بچوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ رحیم کے تین سپاہی دمشق کا کپڑا اور چاندی کے برتن لیے خیمے سے نکلے۔ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بھی کلائی پکڑے لا رہے تھے۔

یہ لڑکی سراسیمگی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور اس کے حسین سنہرے بالوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر نقاب نہ تھا اور اس کی نازل کمر پر زربفت کی پیٹی کسی ہوئی تھی۔ سپاہی حیرت سے اس کی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی عیسائی عورت نہ دیکھی تھی۔

رحیم نے چیخ کر کہا ''عمر اللہ نے ہمیں فتح دی'' فتح کا لفظ بھی کتنا عجیب تھا! سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے رحیم نے کہا ''یہ لڑکی کسی عیسائی امیر کی کنیز ہوگی۔ میں نے ابھی پیچھے ایک کافر کے بچے کو قتل کیا ہے آؤ خیمے میں چلیں''۔

یکا یک یرماق چیخا ''ہوشیار ہو جاؤ اللہ اکبر! سامنے خیموں کے درمیان سے سواروں کا ایک دستہ ہانپتا اور کیچڑ میں لت پت گھوڑے دوڑائے چلا آ رہا تھا۔ یہ سوار اپنے ہاتھوں میں تلواریں اور تبر لیے ہوئے تھے۔ وہ ایسے بگٹٹ چلے آ رہے تھے جیسے جناب ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ وہ سیاہ خود پہنے تھے اور ان کے چہروں سے غم اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔ یہ سوار عیسائی تھے۔

عمر نے اپنی باگ ڈور سنبھال کر گھوڑا موڑا ہی تھا کہ سوار اس پر ٹوٹ پڑے۔ گھوڑا کود کر الف ہو گیا اور عمر زمین پر آ رہا۔

اس کے کندھے میں گرد بھر گئی۔ جب اس نے آنکھیں صاف کیں تو اسے محسوس ہوا کہ وہ زمین پر پڑا ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ایک ملازم زمین پر اپنے جسم کو اس طرح مروڑ رہا ہے جیسے وہ کسی پوشیدہ دشمن سے لڑ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی یرماق جھکا ہوا رحیم کو دیکھ رہا تھا جو زمین سے اٹھنے کی کوشش میں تھا۔

عمر دوڑ کر وہاں پہنچا اور اس نے رحیم کے بازو پکڑے۔ رحیم عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔

عمر چلایا ''میرے بھائی کیا تیرے چوٹ لگ گئی کیسے؟ اس کے رضاعی بھائی نے اس انداز سے اس کی جانب دیکھا جیسے اس کے جواب دینے کے لیے اس کے پاس کوئی لفظ نہ ہو۔ عمر نے یرماق کو ایک صاف کپڑا لانے کو کہا رحیم کے زخمی جسم کو نرمی سے زمین پر لٹا دیا اور زرہ ہٹا کر وہ زخم دیکھنے لگا۔ جس سے خون جاری تھا۔ اس کے ہاتھ نے خود ن کی گرمی محسوس کی جس سے دھیمی دھیمی بھاپ نکل رہی تھی۔

یرمان نے عمر کے کان میں کہا ''آقا! تم کیا کرو گے؟ اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔ اس کے حلق سے جو آواز نکل رہی ہے سنو''۔

عمر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے خون آلود ہاتھ دیکھے اس کے ہاتھوں پر اور زمین پر سورج کی تیز شعاعیں پڑیں اس نے دیکھا کہ رحیم کا چہرہ کپڑے کی طرح سفید تھا۔

اور اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک اس کے حلق سے خرخر کی آواز آتی رہی اور پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

یرماق ایک جانور کی طرح غرایا۔ اس نے میان سے خنجر نکال لیا۔ غصے سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے اور اچانک اس نے قید لڑکی پر جو رحیم کے لمحات نزع میں ان کے قریب بے حس و حرکت کھڑی تھی حملہ کر دیا۔

یرماق نے عیسائی لڑکی پر حملہ کرتے ہوئے کہا ''جان کے بدلے جان''۔

لڑکی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ خنجر کے وار سے اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ وہ عمر کے قدموں مین گر پڑی اور خوف کے مارے اس نے اپنی ٹانگیں ہاتھوں میں دبا لی تھیں اور اس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ خاموش کھڑی اور بڑی درد بھری نظروں سے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

''بیوقوف'' عمر نے ملازم سے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

یرماق زمین پر مردے کی مانند گر گیا اور سسک سسک کر کہنے لگا ''یا اللہ! یا اللہ!''

عمر نے رومی لڑکی کو خیمے میں جانے کے لیے کہا۔ لیکن وہ اس کی زبان نہ سمجھی۔ پھر اس نے خیمے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ خیمے کے اندر چلی گئی۔ عمر دوسرے ملازم کی مدد سے رحیم کی لاش خیمے کے اندر لے گیا اور اسے قالین پر رکھ دیا۔ اس نے ایک کپڑے سے اپنے ہاتھ پونچھنے اور نوکروں کو پانی لانے کا حکم دیا۔

اس پانی سے عمر اپنے رضائی بھائی کا منہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد

لڑکی نے قریب آ کر عمر کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا اور خاموشی سے رحیم کے سر اور گلے سے مٹی صاف کرنے لگی۔ جیسے اسے یہ امید ہو کہ اس کی حرکت سے عمر خوش ہو گا۔ پھر اس نے لاش کے کپڑے ٹھیک کیے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس کو بہت سے کام کرنے ہیں ایسا نہ ہو کہ رحیم کی تجہیز و تکفین میں کوئی کسر رہ جائے۔

اس روز رات کو ایک سفید ریش مولوی نے عمر سے مغموم انداز اور سنجیدہ آواز میں کہا ''میرے بیٹے زم زم کا متبرک پانی بھی زمین میں جذب ہو جاتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بے شک جان اس کی دی ہوئی ہے اور مومنوں کی پاک روحیں قیامت کے دن اسی کی طرف واپس ہو جائیں گی''۔

عمر کی چشم تصور میں رحیم کی صورت پھر رہی تھی۔ اس جسد خاکی کا چہرہ جو کیچڑ سے لت پت زمین پر کفنایا ہوا قبلہ رو پڑا تھا۔ اس کے بعد رحیم کو لحد کی آغوش میں اتر کر اس پر مٹی ڈال دی گئی

اس رات مولوی کو اور بھی مردے دفنانے تھے چنانچہ وہ چلا گیا اور عمر ایک پتھر پر بیٹھا رہا۔ یر ماق وفادار کتے کی طرح عمر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ وہ آگے پیچھے چل رہا تھا۔ اب جبکہ اس کا آقا دفن ہو چکا تھا یر ماق مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن عمر کے لیے جو اپنے اس ساتھ کے کھیلے دودھ شریک بھائی کو کھو چکا تھا اس پتھر کو چھوڑ کر جانا اندوہناک تھا۔ اس پتھر کے قریب رحیم کو ہمیشہ کے لیے لیٹے رہنا ہے۔ اس جگہ بارشیں ہوں گی گھاس اگے گی کھیتیاں بوئی

جائیں گی۔.....اور رحیم بے شمار برسوں تک جن کے گزرنے کے بعد قیامت کے دن روحیں پھر اپنے جسموں میں داخل ہوں گی غیر مرئی پردے کی آڑ میں منتظر پڑا رہے گا۔

عمر ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے گھٹنوں اس پتھر پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ سحر کی سفیدی نمودار ہوگئی پچھلے دو دن اور رات کی تھکن کے بعد عمر کو کچھ ذہنی سکون محسوس ہوا۔اس نے آہستہ سے زیر لب کہا۔''رحیم! جس ایک عارضی مکان ہے جس میں انسان کی روح کچھ دیر کے لیے رہتی ہے۔جب یہ عارضی مکان بن جاتا ہے تو روح اپنے طویل سفر پر روانہ ہو جاتی ہے رحیم اس سفر میں تجھ سے میری ملاقات ہوگی''۔

''امان!''یرماق بولا۔

عمر خیمے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ چراغ جل رہا ہے۔وہ چراغ کو تکنے لگا یہاں تک کہ قیدی لڑکی جو ایک کونے میں پڑے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر پر سو رہی تھی اور اس نے بوتل سے جام میں شراب انڈیلی۔

عمر چاہتا تھا کہ ہاتھ مار کر اس جام کو زمین پر گرا دے۔لیکن اسے وہ رات یاد آ گئی جب نیشاپور کی سڑک والی سرائے میں وہ رحیم باتیں کر رہے تھے۔اور رحیم نے اسے شراب کا ایک جام پیش کیا تھا۔عمر نے جام سے شراب پی لی۔اس کے سرد جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی۔لڑکی نے پھر جام بھرا اور عمر پھر پی گیا۔اس نے ایک لمبی سانس لی اور کمبل پر لیٹ گیا تھکن کی وجہ سے اس پر جلدی ہی غفلت طاری ہوگئی۔

قیدی لڑکی نے چراغ گل کر دیا اور اس کے قریب بیٹھ کر آسمان پر صبح کی سفیدی

کا انتظار کرنے لگی..... جب روشنی نمودار ہوئی اور ہر چیز صاف نظر آنے لگی تو اس نے آئینہ اٹھا کر اپنے بالوں میں کنگھی کی اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر غور کرنے لگی۔

دور وادی کے نشیب میں بالآخر سلطان الپ ارسلان کا خیمہ نصب ہو گیا تھا۔

خیمے کے دروازے پر ترک امیروں کا ہجوم تھا۔ ان میں سے ہر شخص قالین پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں کو ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا۔ جعفرک جسے درباری خاص مراعات حاصل تھیں ایک صندوق پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے وہ ان تینوں اشخاص کو دیکھ سکتا تھا جن میں ایک خود سلطان الپ ارسلان دوسرا رومیوں کا شہنشاہ رومانوس دیوجانس اور تیسرا شخص وہ چھوٹا سا مسلمان غلام تھا جس نے میدان جنگ میں رومیوں کے شہنشاہ کو بے ہوش پڑا دیکھا تھا اور اسے لا کر الپ ارسلان کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

تماشائیوں نے پہلے یہ دیکھا کہ رومانوس کو جو ابھی تک زرہ پہنے تھا۔ سلطان کے سامنے جھکنے پر مجبور کیا گیا۔ الپ ارسلان نے ایک بار اس مقید شہنشاہ کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا اور پھر رومانوس کو اٹھا کر اپنے دائیں طرف قالین پر بٹھا دیا۔

سامعین وہ بات چیت سننے کے منتظر تھے جو پہلی بار مشرق اور مغرب کے ان دو حکمرانوں کے درمیان ہو گی۔

الپ ارسلان نے اپنے معمولی لہجے میں کہا "اگر میں تیرے سامنے قید کر کے اس طرح لایا جاتا تو تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتا؟"

رومانوس نے اپنا سر اٹھایا اور جب سلان کے جملے کا مطلب مترجم نے اسے بتایا

تو اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر وہ بولا ''میں تیرے ساتھ سختی سے پیش آتا''۔

سلطان کے سانولے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے پوچھا ''اور تو مجھ سے کس سلوک کی توقع کرتا ہے؟''

مقید شہنشاہ نے اپنے دشمنوں کے چہروں کو سنجیدہ دیکھا اور کہا ''ممکن ہے تو مجھے یہیں قتل کر دے۔ یا بیڑیاں پہنا کر مجھے اپنی سلطنت میں پھرائے یا مجھ سے تاوان جنگ قبول کر لے''۔

الپ ارسلان کو یہ عیسائی بادشاہ پسند آیا۔ جس میں جرات کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنی فتح پر اور قیصر روکی گردن پر پاؤں رکھنے کے بعد مسرت سے سرشار تھا ایک لمحے کے بعد وہ بولا ''جان لے کہ تیرے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے میں نے اس کے متعلق فیصلہ کر لیا ہے''۔

شیر بچہ جو اس باپ کے پیچھے بیٹھا تھا آگے کو جھکا۔ وہ اپنے مٹھیاں باندھے بیٹھا تھا۔ اسے وہ پیشن گوئی یاد تھی کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گی اور دونوں بادشاہ ختم ہو جائیں گے۔

الپ ارسلان نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھ سے تاوان جنگ لوں گا تیری رعایا سے سالانہ خراج وصول کروں گا اور تجھے عزت سے تیرے مل میں پہنچاؤں گا''۔

شیر بچہ نے گہری سانس لی اور وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اگر رومانوس اسی جگہ جلاد کے

ہاتھوں قتل ہو جاتا تو نیشاپور کے اس نوعمر طالب علم کی پیشن گوئی پوری ہو جاتی۔

عمر کو نیند نہ آئی۔ جسمانی تھکن کے باوجود دیر تک اسکے ذہن کو سکون نہ ملا۔ جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرتا رحیم کا چہرہ اس کی عجب مسکراہٹ' اس کے سامنے آ جاتی۔ رحیم کا جسم مرنے کے بعد ایک لکڑی کے صندوق کے مانند ہو گیا تھا جسے خیمہ کے فرش پر کبھی ایک جگہ رکھا گیا تو کبھی دوسری جگہ اور پھر اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ عمر نے لاکھ کوشش کی لیکن رحیم کا جنازہ لے جانے اور سفید کفن کی تہوں میں اس کی لاش لپیٹنے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے سے نہ ہٹا۔

رحیم کی جگہ ملازموں کو احکام دینا عمر کے لیے آسان کام نہ تھا۔ جہاں تک اسے یاد تھا معمولی بھائیوں کی طرح نہیں بلکہ جڑواں بھائیوں کی طرح وہ دونوں ہر چیز میں حصے دار تھے پھر بھی کھانے' اور ملازموں اور گھوڑوں وغیر کا انتظام ہمیشہ رحیم کرتا تھا۔ لیکن اب قدرتی طور سے ملازمین عمر سے احکام پانے کی توقع رکھتے تھے۔

اب وقت آ گیا تھا کہ یہ لوگ نیشاپور واپس روانہ ہوں۔ ان پہاڑوں میں صرف سلجوق ترکوں کو ٹھہرنا تھا عرب سپاہی اور بے قاعدہ فوجیں تو مال غنیمت اور غلام لے کر واپس بھی ہو چکے تھے

جب یرماق اور باقی دوسرے ملازموں نے خیمہ اکھاڑا تو عمر نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص کے پاس بڑے بڑے بورے ہیں جو ان کے سامان میں شامل نہیں تھے۔ جنگ کے آخری ایام میں یہ لوگ لوٹ مار اور ان چیزوں کو فروخت کرنے میں مصروف رہے تھے۔ جن کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ اور اب وہ یہ دولت لے کر اپنے

گھروں کو جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ لیکن ابراہیمن کے بیٹے نے میدان جنگ سے ایک تلوار تک نہ لی تھی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہ لینا چاہتا تھا جو اسے جنگ کی یاد دلائے۔

یرماق نے رحیم کے ابلق گھوڑے پر زین کس دی تھی اور اپنے مرحوم آقا کی زرہ اور اسلحہ کی جنہیں وہ انے زین سے لگایا کرتا تھا ایک گٹھڑی باندھ لی تھی۔ عمر نے سیاہ گھوڑے کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ تمام راستے اس گھوڑے کو خالی زین کے ساتھ وہ کس طرح لے جائے گا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ اس گھوڑے کو رحیم کے باپ کے پاس واپس پہنچایا جائے۔

یرماق نے کہا ''آقا یہ ٹھیک رہے گا ہم اس رومی لڑکی گھوڑے پر سوار کر دیں۔ ہمارے پاس اس کے لیے کوئی سواری بھی نہیں ہے۔''

قیدی لڑکی رحیم کی ملکیت تھی۔ اس لیے اسے بھی ساتھ لے جانا ضروری تھا۔ اسے نیشاپور کے بازار میں اچھی قیمت پر فروخت کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نوجوان تھی اور اس کے بال ریشم کی طرح نرم و حسین تھے۔ عمر ان یونانی الفاظ کی مدد سے جو اس نے مکتب میں افلاطون کے مکالمات میں پڑھنے کے دوران سیکھے تھے اس لڑکی کے متعلق کچھ باتیں معلوم کر لی تھیں۔

اس کا نام زوئی تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی اور نہ تھا' کیونکہ وہ قسطنطنیہ میں ہمیشہ کنیز کی زندگی گزارتی رہی تھی اس جنگ میں وہ ایک عیسائی افسر کے ساتھ آئی تھی جس کا اپنے شہنشاہ کی طرح یہ خیال تھا کہ وہ مسلمانوں کو کسی دشواری کے بغیر شکست دے کر

مشرق کی جانب بھگا دیا جائے گا۔

عمر نے کہا ''ابلق گھوڑے پر میں سوار ہوں گا اس رومی لڑکی زوئی کو میرا گھوڑا دے دو''۔

حالانکہ وہ لڑکی اب نقاب پہنے تھی اور عمر کے پیچھے باربردار جانوروں کی طرح چل رہی تھی۔ لیکن سڑک پر جو شخص بھی ملتا تھا اس لڑکی کی لباس اور اس کے سنہرے بالوں سے یہ سمجھ جاتا تھا کہ وہ عیسائی کنیز ہے اور اس خراسانی سپاہی کی ملکیت ہے۔ جو خاموش اور تنہا اپنے گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔

پہلی منزل پر عمر کو دشواری پیش آئی۔ سرائے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اسے مجبوراً اپنا خیمہ اس کنوئیں کے قریب نصب کرانا پڑا جہاں ایک بڑے لاؤ لشکر والا امیر پہلے سے خیمہ زن تھا۔ ملازمین عمر کی ہدایت کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔ عمر ہی کو انہیں یہ ہدایات دینا پڑی کہ گھوڑے کہاں باندھے جائیں اور یہ بھی کہ جو اور روٹی امیر کے ہمراہیوں سے خریدی جائے لیکن عمر نے اس مصروفیت کو غنیمت جانا کیونکہ اس طرح اس کا دھیان بٹ گیا لیکن جب سب کام ہو چکا تو پھر رحیم کی یاد اسے ستانے لگی۔

وہ اپنے بستر پر بیٹھا جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ انگیٹھی کی آگ بجھ کر راکھ ہو گئی۔ اسے وہ شراب کا جام یاد آیا تھا جس پی کر جدائی کی صبح چند گھنٹوں کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ لیکن تمام شراب ختم ہو چکی تھی۔ صرف جام باقی تھا۔ عمر نے اطمینان کرنے کے لیے سامان کا تھیلا ٹٹولا۔ چاندی کا جام اس کے ہاتھ میں تھا وہ سوچ رہا

تھا کہ رحیم کی زندگی کا جام اتنی جلدی خالی کر دیا اور اب وہ موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہے۔

عمر کے قریب لیٹی ہوئی عیسائی لڑکی اپنے بستر میں کلبلائی اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ عمر نے جھک کر اسے کے چہرے کے بال ہٹا دیے زوئی کے بال تر تھے اور جانے وہ کس وجہ سے رو رہی تھی۔

عمر نے نرمی سے پوچھا ''ارے کیا بات ہے؟'' زوئی نے لب ہلائے وہ مسکرائی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہے۔ عمر کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اپنے وطن سے دور اس طویل سفر کے دوران میں یہ لڑکی کس چیز کے متعلق سوچتی ہو گی۔ جذبات تو سلطان بھی رکھتا ہے اور غلام بھی۔ لیکن غلام کو شکایت کرنے کی اجازت کہاں!

زوئی کے ریشمی بال اس کے گلے سے لپٹ رہے تھے اور جب عمر نے ان پر ہاتھ پھیرا تو بال پھیل گئے۔ زوئی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک طرف کو ذرا سا کھسک گئی جیسے عمر کے لیٹنے کے لیے جگہ کر رہی ہو۔ عمر کے چھونے سے اس لڑکی کی کمزور نبضیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔

عمر لڑکی کے قریب لیٹ گیا دیر تک وہ لیٹا ہوا خیمے کی چھت پر انگیٹھی کی اس روشنی کو تکتا رہا جو بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت اس کے ذہن سے جنگ کے میدان رات کی اس ہوا اور رحیم کی عجب مسکراہٹ کا خیال محو نہیں ہو سکتا۔

اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی پھر کلبلائی جب اس نے اٹھ کر اپنے لمبے بالوں کو کندھے کے نیچے سے نکالا تو عمر کے ہونٹ اس کے گلے سے مس ہو گئے۔ لڑکی کے جسم کی حرارت اور اس کے بالوں کی خوشبو نے عمر کو کچھ سکون دیا اور پھر عمر نے محسوس کیا کہ اس کا جسم لڑکی کے بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ زوئی کے جسم کی حرارت نے عمر کی تھکن دور کر دی اور اس پر ایسا نشہ طاری رک دیا جو ہر لڑکی کے جسم کی ہر جنبش سے تیز ہو رہا تھا۔

اس رات زوئی کے بازوؤں میں عمر موت کو بھی بھول گیا تھا اور وہ جنگ کے میدان کو بھی۔ دنیا کی ہر شے سے بے خبر ہو کر وہ سکون و اطمینان کی نیند سویا۔

☆☆☆

باب دوم

نمک زار کو جانے والی سڑک پر استاد آئینہ دانش کا مکان عیسائیوں پر سلطان الپ ارسلان کے فتح پانے کے ایک سال بعد

استاد علی کا سن تقریباً ۷۳ سال تھا۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ استاد کو ریاضی سے بھی عشق تھا۔ اس کے مکان میں ہر کام اسی پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ ہوتا تھا جس پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ مچھلیوں کے حوض کے قریب صحن میں گھڑیال سے پانی کے قطرے ٹپکتے تھے۔

شاگرد ایکدوسرے سے کہا کرتے تھے "اب استاد وضو کر رہا ہے" اب ظہر کی نماز کا وقت ہونے والا ہے یا وہ یہ کہتے کہ اب سہ پہر ہو گئی ہے اب استاد اپنی کتاب کا مسودہ لکھے گا۔

پانی کا گھڑیال، پنجگانہ نماز، دو وقت کا کھانا، بارہ گھنٹے کا کام، استاد کے مکان میں اسی باقاعدگی سے عمل پذیر ہوتے تھے۔ جس باقاعدگی کے ساتھ سیارے آسمان پر گردش کرتے ہیں۔ ہر کھانے پر ہمیشہ مقررہ غذا آتی۔ استاد علی سے جس کا لقب آئینہ دانش تھا۔ کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ تھی کہ ممکن ہے کہ اس کے نوجوان شاگردوں کی طبیعت کوئی اور چیز مثلاً کھجور، اخروٹ یا انار کھانے کو چاہتی ہو چنانچہ یہ شاگرد بھی کبھی کبھار چوری چھپے قریب کے کسانوں سے انار خرید لاتے اور مکان

سے دور جا کر کھاتے تھے۔

گاہے گاہے استاد علی اپنی شاندار سنہری عبا پہنے اپنے ٹٹو پر سوار ہو کر نیشاپور جایا کرتا' اپنے ساتھ وہ ایک چھتری اور حبشی غلام کو لے جاتا جو راستہ میں ٹٹو کو ہنکاتا تھا۔ استاد کا مکان نیشاپور کے میدان سے جنوب میں ایک جگہ واقع تھا جہاں مزروعہ علاقہ ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں سے نمک کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ اس مکان میں استاد علی کو اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کے لیے پوری خلوت اور سکون حاصل تھا۔

استاد علی الجبر والمقابلہ پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اسے سلطان کے وزیر نے کئی سال ہوئے یہ کتاب لکھنے کا حکم دیا تھا۔ استاد کے شاگرد سہولت کے لیے اسے الجبرا کہتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ کام تھا کہ استاد انہیں اپنی تشریحات املا کراتا اور وہ اس کی خواہش کے مطابق تجربے کے طور پر سوال نکالتے اور اپنی معلومات کے لے اسے جن دوسرے جوابوں کی ضرورت ہوتی انہیں تلاش کرتے۔ اس کام کے صلے میں استاد علی سہ پہر کو تین گھنٹے ان شاگردوں کو لیکچر دیتا اور انہیں دو وقت کھانا کھلاتا تھا۔

استاد کو اپنے آٹھوں شاگردوں کے نام اور ان کی دماغی کمزوریوں کا علم تھا۔ چونکہ وہ عقل مند آدمی تھا اس لیے یہ کوشش کرتا تھا کہ اپنی معلومت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان کے ذہن نشین کر دے تا کہ اس کے مرنے کے بعد اس شرزمین میں ریاضی کا علم فنا نہ ہو۔

اپنے آٹھ شاگردوں میں اسے عمر خیام کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ عمر خیام کو اس کے پاس آئے صرف دس مہینے ہوئے تھے۔ استاد کا خیال تھا کہ عمر میں پیچیدہ مسائل

حل کرنے کا قدرتی ملکہ ہے اور اس کا تصور خطرناک حد تک زرخیز ہے۔

استاد علی نے بارہا اپنے شاگردوں کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ ریاضی وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر آپ نامعلوم سے معلوم تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں"۔

کافر یونانیوں کی خالی خولی قیاس آرائیوں سے استاد کو اتنی ہی نفرت تھی جتنی ان قدیم مصریوں کے حساب سے محبت تھی جنہوں نے سب سے پہلے اعداد سے کالیا ہے۔ اس کی رائے میں مصریوں کی حساب دانی نے عالیشان عمارتوں کی تعمیر میں مدد دی تھی۔

ایک شاگرد نے سوال کیا خواجہ امام سیاروں کی گردش کا سراغ لگانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق مبارک کے مطابق ہم چاند کی مدد سے مہینوں کا حساب لگاتے ہیں۔ سورج ہمیں روشنی پہنچاتا ہے۔ پھر ستاروں کا مطالعہ کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟

استاد علی نے متفکرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا۔ وہ حاجیوں کا سا سبز عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی سفید مونچھ کو سنجیدگی سے تاؤ دیا۔ اسے نجومیوں کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد تھا۔ لیکن چونکہ سلطان اور دوسرے تمام امراء ان پر اعتقاد رکھتے تھے اس لیے وہ کسی مخالف رائے کا اظہار بھی نہ کرتا تھا۔ شاگرد نے اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا "لیکن استاد کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ وہ سیارہ جسے یونانی عطارد کہتے ہیں پارے پر اثر ڈالتا ہے سورج سے سونا اور اسی طرح چاند سے

چاندی متاثر ہوتی ہے؟ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے''۔

یہ ہر وقت ممکن تھا کہ سلطان کا وزیر جو استاد علی کا سرپرست تھا یہ معلوم کرنے کے لیے آیا کہ استاد کافروں یا ساحروں سے تو کوئی تعلق نہیں ہے اس کے مکان میں اپنا کوئی جاسوس چھوڑ دے۔ اول تو عمر نیشاپور سے بھٹکتا ہوا تنہا اور پیدل اس کے پاس آیا تھا اور اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ریاضی کا ے فاضل استاد سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پھر تعجب انگیز طور پر وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے دوسرے یہ کہ فاضل یہ نوجوان جس کا جسم سپاہیوں اور چوٹ کھائے ہوئے شیر کی طرح مستعد تھا استاد یا معلم بننے کے لیے نہیں پڑھنا چاہتا ہوں گا۔ پھر کس وجہ سے اس نے نمک زاد کے کنارے خود کو اس ویرانی میں مقید کرنا پسند کیا؟

استاد علی نے عمر خیام کے سوال کا جواب اپنے ذہن میں سوچ کر خشک لہجے میں کہا ''علامہ ابوریحان البیرونی نے اپنی فلکیات کی پہلی کتاب کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ ستاروں کا علم ایک سائنس ہے اور واقعات سیاسی کوائف اور شہروں بادشاہزادوں اور عوام الناس کی قسمت میں تبدیلیوں کے متعلق پیشن گوئیاں کرنے میں اس کا سائنس سے خصوصی استفادہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تم پیشن گوئیاں کیے بغیر بھی ستاروں کے علم میں مہارت حاصل کر سکتے ہو لیکن اس مہارت کے بغیر پیشن گوئی نہیں کر سکتے''۔

عمر خیام نے اپنا سر ہلایا گویا وہ استاد کے دانشمندانہ قول کو سمجھ گیا۔ اب تک وہ استاد کی کتابوں میں کسی ایسے نسخے کی تلاش کرتا رہا تھا جس کی مدد سے وہ کیمیا بنا سکے'

لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی تھی۔

عمر نے دبے الفاظ میں کہا ''المجسٹی میں لکھا ہے کہ سونے پر سورج کا اثر ہونا واضح امر ہے کیونکہ سورج کی آگ ہے اور سونے کی ماہیت دریافت کرنے کا واحد ذریعہ ہے بھی آگ ہی ہے۔ کاش ہم آگ کی روح کو مرکوز کر سکتے.....''۔

''کسی بھٹی میں'' دوسرے شاگرد نے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

ایک قدرے معمر شاگرد نے سنجیدہ انداز میں کہا ''دہکتی ہوئی بھٹی میں''۔

استاد علی نے جواب دیا ''یہ چیز کائناتی علم سے متعلق ہے جو فلکی اور ارضی اشیاء کی ماہیت سے بحث کرتا ہے۔ یہ علم ریاضی کے مانند ایک قطعی سائنس نہیں ہو سکتا۔ کون ایمان والا اس میں شبہ کرے گا۔ کہ جب خدائے بزرگ و برتر نے آگ کو اور اس کی ہوا کو پیدا کیا جو پانی کو محیط ہے ج کے حلقے میں ہماری یہ بے حس و حرکت دنیا گھری ہوئی ہے تو اس نے وہ سونا بھی پیدا کیا جو زمین کے سینے میں پایا جاتا ہے؟ کون سچا ایمان رکھنے والا عقل سے اس قدر محروم ہو گا کہ اس چیز کو جسے اللہ نے پیدا کیا ہے خود پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

''درست ہے۔ درست ہے!'' شاگردوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

استاد علی نے یہ بات بڑے اعتماد سے کہی۔ وزیر کو بلکہ خود سلطان کو بھی یہ علم تھا کہ بہت سے جاہلوں نے اس اعلان کے باوجود کہ اس کا راز معلوم ہے۔ کوئی شخص گھٹیا چیزوں سے سونا نہیں بنا سکتا۔ پھر بھی استاد کنکھیوں سے عمر کو دیکھتا رہا تھا جو بے توجہی سے استاد کی باتیں سن رہا تھا۔ اور اپنی گود میں رکھے ہوئے ایک کاغذ کو کوئی شکل بنا رہا

تھا۔ جب دوسرے شاگردوں اور استاد کے درمیان بحث ہوتی تھی تو بسا اوقات عمر اپنے کاغذوں پر لکھنے میں مصروف رہتا۔

شروع میں استاد علی سوچتا تھا کہ عمر اپنی یادداشت کے لیے نوٹ کرتا ہے۔ لیکن اب اسے یہ شبہ ہو چلا تھا کہ کہیں عمر یہ نوٹ وزیر کو دکھانے کے لیے تو نہیں لکھتا' عمر اپنے کاغذ صندل کے ایک صندوقچے میں بند کر کے اپنے بستر کے قریب رکھا کرتا تھا۔

بوڑھا ریاضی دان یکا یک اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے شاگرد کے پاس جا کر اس کے کاغذوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کاغذ پر دو مکعب بنے ہوئے تھے۔ جنہیں بہت سے خطوط کاٹ رہے تھے اور بہت سے ہندسے تحریر تھے۔

استاد نے متعجب ہو کر پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

عمر نے فوراً جواب دیا ''مکعب کی بنیادوں کا مسئلہ'' استاد علی کو یاد آیا کہ اس ہفتے خیام کے اس لڑکے کو اس نے مکعب کے اصول کے متعلق ایک شکل تعدیل حل کرنے کے لیے دی تھی۔

تو نے اسے کہاں تک حل کیا؟ استاد نے پوچھا۔

استاد علی کو شک تھا کہ عمر اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ یونانیوں نے اس کا حل معلوم کیا تھا' لیکن وہ خود اسے حل نہ کر سکا تھا۔ استاد نے دوسرے شاگردوں کو چھٹی دے دی اور عمر کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب استاد علی آرام سے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے عمر کے کاغذ کو

آنکھوں کے قریب لے جا کر غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اتا دبولا ''بھئی میری سمجھ میں تو اس کا مطلب نہیں آتا۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ تو نے مکعبوں کو انتہائی حد و دتک دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور تو یونانیوں کے حل کو پہنچ گیا ہے۔

''وہ اس حل پر کیسے پہنچے تھے؟'' عمر نے اشتیاق سے پوچھا۔

استاد نے آہستہ سے جواب دیا ''ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا''۔

اسے یاد تھا کہ اس نے عمر کو اس تعدیل کا جواب نہیں بتایا تھا اور یہ کہ اکے کاغذوں کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر کلام پاک کے سات رکھے ہوئے تعدیل کا یہ مسئلہ اور اس کا جواب لکھا ہوا ہے۔ وہ ان کاغذوں کو کمرے سے باہر نہیں لے گیا تھا۔ اور اس کی غیر حاضری میں کسی شاگرد کو کمرے میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے ظاہر تھا کہ یا تو عمر نے یہ مسئلہ اپنی عجیب و غریب شکلوں اور خطوط کی مدد سے حل کیا ہے یا پھر چوری سے اس کے کاغذوں کو دیکھ کر اس کا حل کا پتا چلا لیا ہے۔

استاد نے کہا ''مجھے تو صرف اتنا نظر آتا ہے کہ تو نے ان ٹھوس چیزوں کے اضلاع کے ذریعہ مکعب کے اصول کا پتا چلایا ہے۔ تو بتا کہ کس طریقے سے اس حل کو پہنچا؟

''جواب تو موجود ہے'' عمر نے کاغذ پر جھکتے ہوئے کہا ''اس ٹکڑے کو گھٹا دو پھر اسے اور اسے بھی اسے جوڑ دو.....''

''میں اندھا نہیں ہوں۔ لیکن رب کعبہ کی قسم یہ کافر یونانیوں کی اقلیدس کی تعدیل میں مساحت ہے یہ الجبرا بالکل نہیں''۔

''نہ سہی..... لیکن حل یہی ہے۔ اصولوں کے مسئلے کو میں الجبرے کی تعدیل میں حل نہیں کر سکتا تھا''۔

استاد علی نے مسکرا کر کہا ''کیا یہ الجبرے کی تعدیل نہیں تھی؟''

یقیناً۔ اور یہاں سے اسے الجبرے کے ہندسوں میں لکھا جا سکتا ہے۔

''دیکھیے اس طرح سے'' عمر نے استاد کے قریب سر جھکا کر مکعبوں کو غور سے دیکھا اور ریاضی کی عام شکلیں اور خطوط کھینچتا چلا گیا۔ استاد علی نے شکلوں ہی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور اب وہ اسے اپنی کتاب میں شامل کر سکے گا۔

استاد کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوارزمی جیسے استاد نے بھی اپنی کتاب میں یہ مسئلہ حل کرنے کی جرات نہیں کی تھی وہ سوچ کر پھولا نہ سماتا تھا کہ بغداد کے مدرسے کا استاد اس کی اس کامیابی پر کتنے دانت پیسے گا!

''کیا تو نے اس طریقے سے دوسرے مسئلے بھی حل کرنے کی کوشش کی ہے''؟ استاد نے جلدی سے پوچھا۔

عمر نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا ''ہاں اکثر''۔

''اور انہیں حل بھی کیا ہے؟''

''ہمیشہ تو نہیں..... لیکن عام طور پر''۔

''کیا تو مجھے ان کے عمل دکھائے گا۔ استاد نے غیر متوقع اور بالکل عاجزانہ انداز سے کہا۔

عمر ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا ''استاد میں نے آپ کا نمک کھایا ہے آپ

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے اور آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے جو کام آپ نے دیا وہ کیا، لیکن ان دوسرے مسئلوں کے حل میرے اپنے ہیں اور میں انہیں اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہوں"۔

استاد علی کی داڑھی کے بال سمٹ گئے اور ابرو سکڑ گئے وہ بولا "ابراہیم کے بیٹے! تو انہیں کس غرض سیا پنے پاس رکھنا چاہتا ہے"؟

"ابھی مجھے اس کا علم نہیں" عمر نے جواب دیا وہ کھڑکی کے باہر خزاں زدہ باغ کو دیکھ رہا تھا، اسے یہ جواب دینے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہوئی اور نہ تکلف۔

استاد علی کو اس جواب کی بالکل توقع نہ تھی۔ جوں جوں وہ سوچتا تھا اس کے دل میں عمر کے متعلق جس نے بہت زیادہ بے پروائی سے جواب دیا تھا شبہات پیدا ہو رہے تھے۔

بوڑھے ریاضی داں نے کہا "کیا ان مسئلوں کے حل تیرے اس صندوقچے میں رکھے ہیں جو مقفل ہیں؟"

"جی ہاں!"

"لیکن میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا اور میرے کاغذوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دیکھا نہ جا سکے۔ بلکہ اس مسئلے کا جو یونانیوں نے حل کیا تھا وہ بھی تیرے پاس فرش پر پڑا ہے"۔

عمر نے نہ تو اس میز کی طرف دیکھا جس پر قرآن شریف اور اس کی تعدیل کا حل واقعی رکھا تھا اور نہ ہی اپنے چہرے پر کسی تعجب کا اظہار کیا۔ اگر وہ سیاست داں یا

جاسوس ہوتا تو استاد علی کے کمرے کی تلاشی لے سکتا تھا۔

اپنے نوجوان شاگرد کو رخصت کرنے کے بعد استاد علی گھنٹوں مکعب کے مسئلے کو حل کرنے میں لگا رہا۔ شاگردوں کو تعجب ہو رہا تھا کہ اس انہماک میں وہ سہ پہر کا لیکچر دینا بھی بھول گیا۔ عمر کی طرح وہ دوسرا مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں تھا' لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس کا تربیت یافتہ ذہن اقلیدس سے الجبرے کا کام نہ لے سکا..... اس کا دماغ ٹھوس شکلوں رغور کرنے سے قاصر تھا۔

تھک کر وہ سوچنے لگا؟ بوعلی سینا بھی اسے نہ کر سکا اور پھر بھی.....۔

یہ ایک مبہم سا خیال تھا۔ الجبرا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ان مسائل وک حل کرنے میں مددگار ثابت ہوا تھا جنہیں صرف حساب کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اگر یونانیوں کی یہ بے ہودہ اقلیدس بھی اسی طرح وہ مسئلے حل کر دے جو الجبرے کے دائرے سے باہر ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اگر ہندسوں پر انتہائی حد تک بحث کرنے کے لیے اقلیدس کے سہ اطرافی علم سے ماورا کوئی ایسا فن پیدا ہو جائے جس کا ابھی قیاس بنی نہیں کیا جا سکتا تو کیا ہوا؟ استاد علی نے بیزار ہو کر اپنا قلم اور کاغذ پھینک دیا۔

اس نے ایک سہ پہر ضائع کر دی تھی۔ یہ تمام قیاس آرائیاں لغو تھیں ان کا ریاضی کے قطعی علم سے کوئی تعلق نہیں۔ استاد نے اپنے دل میں یہ نتیجہ نکالا کہ عمر اس کے کمرے میں گھس گیا ہوگا اور اس نے یہ حل وہاں سے حاصل کر کے اس کی مدد سے یہ جھوٹے مکعب بنائے ہیں۔ غالباً اس کے علاوہ عمر کے صندوقچے میں اور کوئی حل نہ ہو

گا۔ شاید وہ جاسوس ہے اور اپنی رپورٹیں صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے تا کہ انہیں اپنے ساتھ نیشاپور لے جائے یا کسی اور ذریعے سے وہاں سے بھیج دے۔

استاد علی نے اپنے دل میں یہ نتیجہ نکالا کہ عمر کا حل علیحدہ رکھ دیا۔ کھڑکی سے گھڑیال کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک آہ بھری کیونکہ گھڑیال میں یہ دیکھ کر اسے ملال ہوا کہ مغرب کی نماز میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔ وہ جلدی سے حوض پر گیا اور وضو کرنے لگا۔

ایک ہفتے بعد بوڑھے ریاضی دان کو ایک بار پھر عمر خیام کی موجودگی سے پریشان ہونا پڑا۔

اس روز سہ پہر کے وقت استاد علی کے مکان پر ایک سوار پہنچا۔ اس سوار کے ہمراہ تقریباً ایک درجن پیادے تھے۔ فوراً فراش نے دروازے سے مکان کی نا درونی دروازے تک ایک قالین بچھا دیا۔ اور ایک غلام جلدی سے اندر جا کر یہ بتایا کہ توتوش استاد علی سے ملاقات کرنے آیا ہے۔

ساتھ ہی توتوش مکان میں داخل ہوا۔ توتوش کا جسم گول اور موٹا تھا وہ ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا اس کے سر پر ایک نیلا عمامہ اور اس کی آواز میں عجیب اتار چڑھاؤ تھا۔ وہ اپنے غلاموں کو ضروری ہدایات دے کر توا استاد علی کے غلاموں سے بار بار اس کے آقا کی خیریت پوچھنے لگا۔ اور جب استاد علی اپنی بہترین سیاہ عبا پہنے باہر آیا تو توتوش اسے دیکھتے ہی مسرت سے چیخ اٹھا۔ اور علی کو اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''خالق دو جہان کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور احسان ہے کہ نامور استاد آئینہ دانش کی صحت برقرار ہے خدا کرے یہ آئینہ سینکڑوں سال تک چمکتا اور ہم جاہلوں کو اس عہد اور اس صدی کے دانشمندانہ خیالات دکھاتا رہے''۔

اس پر خلوص استقبال اور دعا کے جواب میں علی نے مناسب حال عاجزی دکھائی۔ لیکن توتوش نے اس کی ہر عاجزی کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ''نہیں نہیں استاد! تمام نیشاپور جانتا ہے کہ استاد کا درجہ خوارزمی اور بغداد کے اس احمق استاد سے بلند ہے میں کہتا ہوں کہ کیا بوعلی سینا کو استاد علی سے زیادہ علم حاصل تھا؟ نہیں ہرگز نہیں''۔

وہ مہمان خانے میں قالین پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شربت اور پھل رکھے تھے استاد علی توتوش کی چرب زبانی کے آگے گونگا معلوم ہوتا تھا۔ اول تو وہ توتوش کو بولنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ دوسرے توتوش کے متعلق اسے زیادہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس وزیر کا ایجنٹ ہے جو استاد علی کا سرپرست تھا۔ نیشاپور میں یہ مشہور تھا کہ توتوش فیروزہ، نازک چینی کے برتن اور قیمتی قلمی نسخے جمع کرتا ہے لیکن توتوش نہ کوئی خطاب قبول کرتا تھا اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟

استاد علی اور توتوش ایک گھنٹے تک استاد کی زیر تصنیف کتاب کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد توتوش نے عمر خیام نامی طالب علم سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ استاد علی کے کان کھڑے ہو گئے۔ جب عمر باغیچے سے کمرے میں آ کر قالین کے ایک کونے میں بیٹھ گیا تو استاد ان دونوں کو کنکھیوں سے

دیکھتا رہا عمر نہایت تمیز کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھے قالین پر دوزانو بیٹھا تھا۔

توتوش نے باتوں باتوں میں کہا ''پچھلے ماہ ہمیں مشرق سے یہ خبر ملی تھی کہ عیسائیوں کے بادشاہ رومانوس دیوجانس کو اس کی رعایا نے گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی اور وہ اسی صدمے سے مر گیا''۔

یہ سن کر عمر مغموم ہو گیا۔ اسے وہ جنگ اور اپنے رضاعی بھائی کی موت یاد آ گئی۔

توتوش نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''تعجب ہوتا ہے ہمارے آقا سلطان الپ ارسلان کا سایہ خدا ہمیشہ ہم پر قائم رکھے اسنے اس بادشاہ کی جان بخشی کر دی تھی..... اور پھر اسے خود ہی اس کی رعایا نے قتل کر دیا۔ اس بات کا کسے اندازہ ہو سکتا تھا''۔

یہ کہہ کر اس نے عمر کی طرف دیکھا۔

''کسی کو نہیں'' عمر نے جواب دیا کیونکہ توتوش اس سے جواب پانے کا متوقع معلوم ہوتا تھا۔

عمر کو بزرگوں کی اس مجلس سے رخصت کی اجازت مل گئی اور توتوش کی زبان پہلی مرتبہ بولنے سے رکی۔ وہ ہاتھی دانت کی اس تسبیح سے جو اس کے گلے میں پڑی تھی اس انداز سے کھیل رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہے.....۔

توتوش نے بے توجہی سے کہا ''کی تم پیشن گوئی کے علم پر اعتقاد رکھتے ہو؟ کیا آئندہ کا حال بتانا ممکن ہے؟''

لیکن استاد عی کسی ایسی بحث میں نہیں الجھ سکتا تھا اور پھر وہ بھی اپنے طاقتور

سرپرست کے خفیہ ایجنٹ کے ساتھ۔

وہ بولا ''ایمان کی قسم! اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہیچمداں تو اپنی کتاب کی تکمیل میں منہمک ہوں''

تو توش نے منہ ہی منہ میں استاد کے جاب سے اتفاق رائے کا اظہار کیا اور پھر پوچھا۔ ''فرض کرو ایک شخص تین پیشن گوئیاں کرتا ہے تو اسے آئینہ دانش کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کی تینوں پیشن گوئیاں محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جائیں؟''۔

اس سوال نے بوڑھے استاد کی فطری صلاحیتوں کو جگا دیا وہ بولا ''دو پیشن گوئیاں تو اتفاق سے صحیح ثابت ہوسکتی ہیں لیکن تینوں ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ لیکن کون جوتشی اتنا بیوقوف ہوگا کہ بیک وقت تین باتوں کی پیشن گوئی کرے؟''

''ارے خود تمہارے شاگردوں میں سے ایک ایسا شخص موجود ہے جو زائچہ بنانے کا ماہر ہے اور یہ وہ نوجوان طالب علم ہے جس سے میں ابھی ابھی باتیں کر رہا تھا''۔

استاد علی کی داڑھی کے بال ایسے ہلنے لگے جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ اس نے حیرت سے کہا ''عمر کم از کم اس چیز کی تو مجھے اس سے بالکل توقع نہیں ہے''۔

''واللہ! پھر وہ کیا کرتا ہے؟''

''معزز مہمان !وہ مکعب کی تعدیلوں کو اتنی ہی آسانی سے حل کر لیتا ہے جتنی آسانی سے آپ اپنے ریشمی دھاگے کی تسبیح پر دانے گنتے ہیں''

''اوہو تو پھر تو اسے ایک کام میں مہارت حاصل ہے۔ فرصت کے اوقات میں

وہ کیا کرتا ہے؟''

وہ میری سب کتابیں پڑھا کرتا ہے۔ ریگستان میں تنہا گھوما کرتا ہے۔ انار رکھاتا چوسر کھیلتا اور بہت کم بولتا ہے اور کچھ ایسے سوال بھی حل کرتا ہے جسے وہ ایک صندوقچے میں چھپا کر رکھتا ہے'' یہ آخری جملہ کہتے وقت استاد علی کے لہجے سے کچھ عداوت ٹپک رہی تھی۔

''کوئی نوجوان ریگستان میں مارا مارا کیوں پھرے واللہ اے آئینہ دانش معمر ہو جانے کی وجہ ہمارے ولولے سرد پڑ گئے ہیں لیکن نوجوانوں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ غالباً آپ کے اس شاگرد کو ریگستان کی ویرانی میں کوئی حسین محبوبہ مل گئی ہے''

''یہاں تو کوئی عورت نہیں سوائے ان بدصورت دھوبنوں کے جن کے بدن پر جوئیں سرسراتی رہتی ہیں''۔

جتو توش نے منہ بنالیا۔ اس کے چہرے سے ایسی افسردگی ٹپک رہی تھی کہ جیسے وہ چمن کی تلاش میں کسی ریگستان میں پہنچ گیا ہو۔ اور پھر بھی چمن کو دیکھنے کا متمنی ہو۔ وہ اپنی انگلیوں سے تسبیح پھرا رہا تھا اور آنکھیں جلدی جلدی سے جھپکا رہا تھا۔ وہ کہنے لگا'' اوہو یہ تو عجب طالب علم ہے جو اتنا لائق اور پھر اتنا خاموش ہے۔ صرف اس عالم الغیب ہی کو علم ہو سکتا ہے کہ آیا یہاں کوشخص چھپا کر سفلی عمل کرتا ہے استاد کیا تم خیمہ دوز کے اس لڑکے کی قابلیت کی پوری جانچ کرو گے اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے لکھ کر اسے ایک لفافے میں سربمہر کر کے ایک ماہ کے نادراسی کے ہاتھ میرے پاس

بھجوا دو گے تا کہ وہ جمعے کی شام یہ لفافہ مجھے نیشاپور کے باب طاقین پر پہنچا دے۔
اچھا اب..... تو توش نے گہری سانس لی اور مسکراتا ہوا اٹھا اور پھر بولا۔

''اب میں جسے علم کی تلاش ہے آپ کے مکان میں جو علم کا گھر ہے جاتا ہوں
افسوس کہ میں نے آپ کو بہت تکلیف دی ہے''۔

مہمان کے جانے کے بعد استاد کچھ دیر بہت متردد رہا۔ وہ تعجب کر رہا تھا کہ اسے
عمر کی نگرانی کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ اسے یہ شبہ تھا کہ عمر خود اس کی نگرانی پر مامور
ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے عمر کے متعلق اپنی رائے لکھنے
کی تاکید کی گئی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ کہیں اس کی نگاہوں کے سامنے ہی ان دونوں
نے آپس میں کوئی خفیہ بات چیت تو نہیں کی۔ پھر وہ اس بات پر تعجب کر رہا تھا کہ عمر
کو نیشاپور کیوں بلایا گیا ہے۔ استاد علی ان تمام باتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ لیکن استاد علی عمر کا راز معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس کی
سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عمر خیام الجبرے کے عام مسائل پر توجہ کیوں نہیں دیتا اور نئے
مسائل حل کرنے کا کیوں متمنی رہتا ہے۔ یقیناً اسے کسی روحانی طاقت کی تائید
حاصل نہیں ہے عمر ان مسائل کو خود اپنے ریاضی کے ضابطوں کی مدد سے حل کرتا
ہے۔ بات تو یہی تھی۔ لیکن استاس کو عمر پر تعجب ہوتا تھا اور حسد بھی، لیکن اسے
اطمینان نہیں ہوتا تھا۔

شام کے وقت استاد علی نے عمر سے اچانک کچھ باتیں تسلیم کرانے کی کوشش کی
جیسا کہ وہ اس سے قبل مکعبوں کے معاملے میں کر چکا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''عمر تو نظام الملک کے پاس کب واپس جائے گا؟''

نظام الملک سلطان الپ ارسلان کا وزیر اعظم تھا ملک میں اس کا طوطی بولتا تھا اور وہ استاد علی ارتو توش کا بھی سرپرست تھا۔

عمر نے تعجب سے جواب دیا ''واپس ہوں گا؟ میں نے تو اسے کبھی دیکھا تک نہیں''

''پھر خدا کے لیے بتا کہ تو یہاں کس لیے ہے؟''

اس کے جواب میں عمر نے کہا کہ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد میں اپنے رضاعی بھائی رحیم کے یہاں رہنے لگا تھا۔ لیکن جب میدان جنگ سے واپس آیا تو رحیم کے گھر والوں نے مجھے منحوس قرار دیا جیسے رحیم کے مرنے کے بعد مجھے ان کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ انہوں نے زوئی کو بھی مجھ سے لے لیا تا کہ غلاموں کے بازار میں اسے فروخت کر دیں۔ اس کے بعد میرے لیے نیشاپور کی گلیوں میں جہاں میں نے رحیم کے ساتھ مسرت کے دن گزارے تھے آوارہ پھرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ میں آپ کے پاس یہاں اس امید پر تعلیم حاصل کرنے چلا آیا ہوں کہ ایک نئے کام میں لگ جاؤں۔

استاد علی نے کہا ''اور وہ کام کون سا ہے؟ تو مکتب سے کون سا علم حاصل کر کے عرصہ حیات میں داخل ہوگا؟ لیکن تو پہلے اس بات پر غور کر کہ اس عالم سفلی میں عقلی و دانش کیسے آئی اور دنیا کو عقل و دانش پیغمبروں نے سکھائی ہے جنہوں نے خود بھی تعلیم نہیں پائی، لیکن انہیں عالم باطن کے متعلق علم لدنی حاصل تھا عقل کی روشنی پھیلانے

والوں میں سب سے پہلے پیمبروں کا درجہ ہے اور ان کے بعد فلسفیوں کا۔ وہ پیمبروں کی تعلیمات کا مطالعہ اور اس کے بعد دوسرے علوم کا اکتساب کر کے عوام الناس کو وہ باتیں سمجھاتے ہیں جن تک ان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔

''ممتاز پیمبروں میں زمانے کے لحاظ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ہوئے دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تیسرے ہمارے پیغمبر جناب محمد علیہ التحیہ والتسلیم۔ یہ امر یقینی طور پر معلوم ہے لیکن جہاں تک فلسفیوں کا تعلق ہے لوگوں میں اختلاف رائے ہے۔ افسوس کہ میری معلومات کم ہیں اور میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پہلے افلاطون اور ارسطو اور پھر ہمارے استاد بوعلی سینا نے ہمارے تاریک ذہنوں کو عقل کی جلا دی''۔

''فلسفیوں کے بعد شاعروں کا درجہ ہے۔ شاعری کا فن خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ شاعر کا کام تخیل انسانی کو بیدار کرنا ہے اور بڑی چیز کو حقیر اور حقیر کو بڑا بنا کر پیش کرنا ہے غصے اور محبت، مسرت اور انفرت کے جذبات کو بھڑکا کر وہ اس دنیا سے بڑے اور حقیر سے حقیر سے کام کرا لیتا ہے''

''چونکہ وہ تخیل کو مہمیز کرتا ہے اور عقل کو روشن نہیں کر سکتا اس لیے شاعر کا فن فلسفی کے علم سے پست ہوتا ہے۔ آج تک ایسا کون شاعر گزرا ہے جس کے کلام نے کسی معنی کے فن کو حیات جاوید بخشی ہو''۔

''ریاضی داں کی محنت اکارت نہیں گئی۔ روشن حقیقت تک صرف وہی پہنچتا ہے۔ اور نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے والے واحد راستے کو وہی دریافت کرتا ہے۔

الجبرا ریاجی کی بلند ترین شاخ ہے اور مجھے امید ہے کہ تو الجبرا کی تیسرے درجے کی تعدیلوں کو حل کرنے میں اپنی لیاقت کام میں لائے گا"

بوڑھے استاد کے الفاظ نے عمر پر بہت اثر کیا اور وہ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا "میرا مطلب ..... یہ ہے کہ اور بھی مسائل موجود ہیں کاش ہماری عقل انہیں حل کر سکتی۔ کاش ہم ستاروں کی گردش کے راستے ناپ سکتے....."

"ستاروں کے راستے؟ لیکن یہ تو فلکیات کا کام ہے جس کا مقصد انسان کے معاملات پر سیاروں کے اثرات کا تعین کرنا ہے"۔

"پھر بھی مسائل یکساں ہیں"

"میرے شاگرد کیا تو یہ کہتا ہے کہ میری کتاب کے مسائل شاہی منجم کے مسائل کی مانند ہیں؟ یہ احمقانہ بات ہے ..... یہ بات سن کر مجھے افسوس ہوا....."

"لیکن حقیقت تک رسائی ہو جائے تو ایک مسئلے کے دوسرے کے مسئلے کی حقیقت سے مختلف نہیں ہے"

استاد علی نے ایک آہ بھری اور کہا "میرے بیٹے! تو ایسی فضول خواہشوں کے لیے بہت کم عمر ہے وقت آنے پر تجھے لازمی طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک فن جس حقیقت کا اظہار کرتا ہے وہ دوسرے فن سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر سلطان کا نجومی اپنی کوششوں کو ریاضی کی حقیقت تک محدود رکھتا تو....." اس وقت استاد علی کی داڑھی ہلنے لگی اس کی آواز بھر کر حلق میں پھنس گئی وہ ہنسنے لگا لیکن فوراً ہی وہ اپنی اس

فروگزاشت پر نادم ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا ''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دماغ مختلف راہوں پر چل رہے ہیں میری خواہش تھی ..... کہ میں ریاضی کے ذریعے حقیقت کا مطالعہ کرنے میں تجھے مدد دیتا۔ نامعلوم سے معلوم تک پہنچنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اچھا کل میں تجھے ایک خط دوں گا۔ اسے تو نیشاپور لے جانا۔ ممکن ہے وہاں تجھے کوئی سرپرست مل جا۔ خدا کرے تیرا سفر خوشگوار گزرے!''

عمر اٹھا تو وہ سوچ رہا تھا۔ اس بوڑھے استاد کو وہ بہت سی باتیں بتانی چاہتا تھا۔ لیکن اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس پر ایک اور دروازہ بند ہو گیا۔

عمر چلا گیا تو استاد علی نے قلم لیا اور ایک قیمتی سفید کاغذ پر حسب ذیل عبارت لکھنی شروع کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا شاگرد عمر خیام لیاقت میں بغداد کے استاد تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے پاس وہ راز ہے جس کی مدد سے وہ تمام مسائل حل کر لیتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ راز کیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس راز سے کام لے گا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے تخیلات کا غلام ہے۔

''میں درخواست کرتا ہوں کہ اسکا یہ علم جو اس نے میرے گھر سے حاصل کیا ہے میرے اس سرپرست اور مربی کو پسند آئے جس کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ وہ اس نالائق علی سے زیادہ وفادار غلام نہیں رکھتا''۔

جب تحریر کی روشنائی خشک ہو گئی تو استاد علی نے کاغذ کو تہہ کیا اور تہوں پر پگھلا ہوا

موم لگا کر اپنی مہر لگا دی اور اس خط پر ''آقائے توتوش باب طاقین' نیشاپور' کا پتہ لکھ دیا۔

جمعے کے دن مغرب کی نماز سے قبل باب طاقین اور مسجد ابنائے حسین کے درمیان شیرینی فروشوں کی گلی

عمر گلی میں اکڑوں بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیخ تھی جو ابھی ابھی آگ پر سے اتاری گئی تھی۔ اس گرم سیخ سے عمر بکری کے کباب اور لہسن کے ٹکڑے نوچتا اور اپنے گھٹنے پر رکھی ہوئی روٹی کے لقموں کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھاتا جاتا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی وہ نمک زار کے کنارے سے صبح ہی چل پڑا تھا راستے میں کہیں نہ ٹھہرا تھا بیشتر مسافت اس نے اس گدھے پر طے کی تھی جو نمک کی بوریاں لانے والے ایک اونٹ کے قافلے کے ساتھ آ رہا تھا۔ اونٹ والوں سے باتیں کرنے اور ان کے گیت سننے میں عمر کو دھوپ کی گرمی بھی زیادہ محسوس نہ ہوئی اور راستہ اچھا کٹ گیا۔

مخالف ہوا میں دن بھر سفر کر کے ابراہیم کا بیٹا ہمیشہ مسرت محسوس کرتا تھا۔ گلی میں بیٹھا وہ ان آخری مسافروں کو دیکھ رہا تھا جو میدان طے کر کے باب طاقین سے نیشاپور پہنچ رہے تھے..... کھٹ پٹ دوڑتے ہوئے کچھ گدھے درویش اور ان کے پیچھے ایک لاوارث بھیڑ کمہاروں کے چاک کے لیے چکنی مٹی سے لبالب بھری چوں چوں بولتی ہوئی ایک گاڑی اور ان کے بعد گھوڑوں کی شاندار قطاریں جن کی پیٹھ پر

بھاری بوجھ لدا تھا اور جو چلتے میں ایک ساتھ سر ہلاتے تھے۔

کباب والے نے عمر سے کہا "ہاں یہ سمرقند سے آ رہے ہیں۔ آج کل سمرقند کی سڑک سے آنے والے مسافروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے"۔

"اور وہ کیا لاتے ہیں؟" عمر نے پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے ہاتھی دانت، ریشمی دھاگا، مشک، بلور، پیتل اور ریوند چینی، غرض کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کے ساتھ نہ آتی ہو"۔

"لیکن ایسے کباب نہیں جیسے یہ ہیں" عمر نے مسکرا کر کہا اور خالی تیخ دکان دار کو واپس کر دی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین پیسے گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ۔ماشاءاللہ ہماری بھیڑیں توانا ہوتی ہیں۔

دکان دار عمر کا جملہ سن کر مگن ہو گیا۔ اور اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا "ابے نالائق کے بچے اونگھ رہا ہے دیکھتا نہیں کہ نواب صاحب کو پیاس لگی ہے پانی پیش کر"۔

ان کے قریب ایک لڑکا اپنے کاندھے پر پیتل کا ایک بڑا سا برتن لادے کھڑا تھا۔ پھل والے کی دکان کے سامنے ایک قصہ گو جو کہانی سنا رہا تھا۔ لڑکے کا دھیان اس کی طرف تھا۔ دکان دار کی ڈانٹ سن کر وہ مڑا اپنی پیٹی سے چینی کا ایک پیالہ نکالا اور اس میں پیتل کے برتن سے پانی بھر کر عمر کو دیا۔ عمر نے خوش ہو کر پانی پیا پیالے میں دوبارہ پانی ڈال کر ہاتھ دھوئے اور لڑکے کے دیے ہوئے تولیے سے ہاتھ پونچھے۔

''خدا کے نام پر'' لڑکے نے آہستہ سے کہا اور عمر نے اس کے ہاتھ پر ایک پیسہ رکھ دیا۔ ادھر کباب والا بڑبڑایا اور کہنے لگا یہ سستے بڑے لالچی ہیں پیسہ لیے بغیر کسی مسلمان کو پانی تک نہیں پلاتے۔

''اور بھوکے مسلمان کو کھانا کھلانے کے متعلق کیا خیال ہے؟'' عمر نے مسکرا کر پوچھا۔

''جناب مجھے کوئی ایسا شخص بتا دیجیے جو مجھے ایک بھیر بھی مفت دے اور پھر جلانے کے لیے کوئلہ تیغ گھمانے کے لیے ایک چھوکرا بھ مفت مل جائے تو میں بڑی خوشی سے مفت کباب بانٹوں''۔ کباب والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور پھر بولا۔

''لیکن غالباً آپ زائر ہیں اور مشہد مقدس کی زیارت کو جا رہے ہیں۔ پھر وہ عمر کے دیے ہوئے تین پیسوں کو گننے لگا۔ اسے یہ نوجوان طالب علم شان اور مزاج کے لحاظ سے عرب معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے جسم پر اونٹ کے بال کی صرف ایک عبا اور ایک خرجی تھی اس کے باوجود اس کی باتیں.....

عمر نے کہا ''مجھے معلوم نہیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں''۔

بس یہ وہ سوچ کر مطمئین تھا کہ وہ بھی اس ہجوم میں شامل ہے جو شیرینی فروشوں کی گلی سے گزر کر قریبی مسجد کو جا رہا ہے جمعے کا دن تھا اور بہت سے نمازی مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے۔

گلی میں اب زیادہ دھوپ نہیں رہی تھی۔ لنگوٹیاں باندھے کچھ ننگے لڑکے مشکوں سے گلی میں چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ راہگیروں کے چلنے سے شور ہو رہا تھا۔ لیکن اندھے

قصہ گو کی بلند آواز اس شور میں بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ ان عاشقوں کا حال بیان کر رہا تھا جو ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے تھے۔

عمر کے سامنے سے ایک نازک اندام لڑکی گزری اس کی چال آہستہ ہو گئی۔ اس نے لڑکی کی سرمگیں آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے اور وہ سنہری زلف جو نقاب سے باہر چمک رہی تھی عمر کو جانی پہچانی سی نظر آئی۔ اسے زوئی کا خیال آنے لگا۔ وہ اپنے کاغذ اور کتابیں لے کر فوراً کھڑا ہو گیا اور اس لڑکی کے پیچھے چل دیا جس نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

کباب فروش نے اطمینان کی سانس لی اور پیسے اپنی صندوقچی میں ڈال دیے ''وہ زائر نہیں معلوم ہوتا'' دکان دار بڑبڑایا اور پھر چیخنے لگا ''آؤ کسے بھوک لگی ہے کون عمدہ گوشت کھانا چاہتا ہے۔ آؤ کباب کھائی ان مس نہ ہڈیاں ہیں اور نہ یہ باسی ہیں''۔

دور مسجد کے مینار سے موذن کی آواز آ رہی تھی۔

حی علی الصلوۃ۔ حی الصلوۃ۔ لا الہ الا اللہ

سجود کے بد قیام اور قیام کے بعد سجود عمر نماز کے مقرر ارکان ادا کر رہا تھا۔ اوپر لٹکے ہوئے فانوسوں سے روشنی آ رہی تھی اور نمازیوں کی آواز سے مسجد میں عجب سی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے قریب صف میں کھڑے ہوئے نمازیوں کے کپڑے سرسراتے جاتے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر عمر دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد سے باہر نکلنے لگا تو اس

کی نگاہیں عورتوں کی اس ٹولی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

نیلے نقاب والی لڑکی ان عورتوں کے پیچھے چل رہی تھی اور ایک موٹا سا نوکر اس کے ساتھ تھا۔ صحن میں جا کر اس نے اپنے جوتے اس طرح بے پروائی سے باندھے کہ چند قدر چلنے کے بعد ان میں سے ایک گر گیا۔

وہ پیچھے دوڑ کر آئی اور عمر کے بالکل قریب جھک کر اپنا جوتا اٹھانے لگی۔ راہگیروں کے قدموں کی آواز کے شور میں اس نے لڑکی کو آہستہ سے یہ کہتے سنا ابراہیم کے بیٹے! میری سالگرہ پر گلاب کے پھول نہیں تھے۔

عمر جواب نہ دینے پایا تھا کہ لڑکی چل دی اور پھر بڑی شان سے نگاہیں نیچی کر کے ملازم کے ہمراہ چلنے لگی۔ تب عمر کو یاد آیا کہ آج سے تین سال پہلے یاسمین نام کی ایک بچی نے اسے گلاب کا پھول دیا تھا۔

جب وہ شیرینی فروشوں کی گلی سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ باب طاقین بند ہو چکا ہے اور چند ترک نیزہ باز وہاں پہرہ دے رہے ہیں۔ جھٹ پٹا وقت تھا اور دکان دار اپنی دکانوں میں چراغ جلا رہے تھے۔

"خدا کی پناہ خیال زیادہ جلدی نہ کرو"۔

ایک پستہ قد اور موٹے شخص نے جو چمکدار اور زعفرانی رنگ کی ریشمی عبا پہنے ایک خوبصورت ٹٹو پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا عمر نے کہا عمر نے پہچان لیا کہ وہ توتوش ہے۔ اس نے جیب سے استاد علی کا خط نکال کر اسے دیا۔ موٹے توتوش نے فوراً خط کھولا اور ایک چراغ کے قریب جھک کر اسے پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد خط کو

تہ کر کے اس نے اپنی جیب میں رکھا اور عمر کو ایک نقرئی درہم دیا معلوم نہیں تو توش اس خط سے خوش ہوا تھا یا نہیں۔ پھر بھی استاد علی نے عمر کو کنایتاً یہ بتا دیا تھا کہ تو توش جوایوان دانش میں استاد علی سے ملنے آیا تھا اس کا دوست بن سکتا ہے۔

تو توش نے اپنی تسبیح کے دانے گنتے ہوئے کہا ''نیشاپور میں تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''خواجہ علی کے دوست! اب میرا کوئی گھر نہیں ہے'' تو توش نے اس نوجوان کی پھٹی عبا اور بوسیدہ خرجی کو غور سے دیکھا اور ایسی لاپروائی سے جیسے وہ کسی کتے کو ٹکڑا ڈال رہا ہو کہا ''شاید میں ایک زین ساز کے مکان میں تیرا ٹھکانہ کر سکوں بشرطیکہ تو اس کے آٹھ بچوں کو قرآن پڑھا سکے''۔

تو توش کے لہجے اور رویے میں سراسر بدتمیزی تھی۔ عمر کو تاؤ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔ ''غریبوں کے محافظ آپ کسی خوجے کے لڑکے کے لیے جس نے مکتب میں کچھ تعلیم حاصل کی ہو ٹھکانا تلاش کیجیے اب مجھے اجازت دیجیے''۔

یقیناً تو توش نے لاپروائی سے کہا اور اپنے ٹٹو کی باگ موڑ کر ایک طرف چل دیا۔ آگے چل کو وہ رکا اور ایک فقیر کے کاسے میں جو یا حق کی صدا لگا رہا تھا ایک سکہ ڈال دیا۔

اس نے چپکے سے فقیر سے کہا ''بھوری عبا والے اس نوجوان کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ کیا کرتا ہے اور اس وقت تک اس کا پیچھا کیے جاؤ جب تک اس کی قیام گاہ کا پتہ نہ چل جائے''

فقیر نے آہستہ سے جواب دیا ''حضور کا جو حکم'' اس نے سکہ اٹھا کر زور سے جما ہی لی اور اپنا لبادہ اس طرح سمیٹا کہ گویا اس امیر کی خیرات پانے کے بعد اسے آج کی روزی پہنچ گئی ہو۔

عمر راہ گیروں کے ہجوم کے ایک سائے کی مانند چل رہا تھا۔ گوہر دھوئیں اور پیاز کے بگھار کی خوشبو سونگھ کر اسے عجب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر تو توش نے مجھے حقارت سے دیکھا تو کیا ہوا؟ میری جیب میں دو درہم ہیں اور کچھ عرصے کے لیے تو میں ٹاٹ سے گزارسکتا ہوں۔ میں اپنے پرانے مکان میں جا کر اسی چھت پر سو جاؤں جہاں گھاس کی بھینی خوشبوئیں ہوں گی اگر اس محلے کے بھلے لوگوں کو دنیا کی کچھ خبریں سناؤں تو وہ یقیناً میرے سامنے کھانا رکھیں گے۔ کاش رحیم یہاں ہوتا''۔

کتب فروشوں کی گلی میں پہنچ کر عمر اس پرانے چشمے کے پاس ٹھہرا۔ اس نے اپنے تصور میں دیکھا کہ وہ لڑکی جو پانی کا گھڑا لیے کھڑی تھی جھکی اور اس نے گھڑ کا منہ پانی کی دھار کے نیچے کر دیا۔ پھر عمر پتھر پر اس کے قریب بیٹھ گیا لیکن اب جبکہ وہ اس کے پاس لوٹ آیا تھا وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ چنار کے درخت کے نیچے اندھیرا تھا اور نقاب کے گوشوں سے لڑکی کی آنکھیں اسے دیکھنے کی کوشش میں تھیں۔ بے تابی سے لڑکی نے اپنے ماتھے سے بالوں کی لٹ ہٹائی۔ عمر نے اس کی تیز سانسوں کو سنا اس تاریکی میں یاسمین موجود تھی۔ وہ بالکل بدل گئی تھی وہ خاموش تھی اور نقاب پوشوں بھی اس کا جسم گلاب سے معطر تھا۔ گھڑا بھر گیا۔ اور اس میں

سے پانی بہنے لگا۔لڑکی نے حرکت نہ کی۔وہ بڑی ہو گی تھی۔اور اس کا عریاں سفید بازو اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

بوجھل آواز میں عمر بڑبڑایا ''یاسمین تو یہاں کس کا انتظار کر رہی ہے''؟

لڑکی چونک پڑی جیسے اسے چوٹ لگی ہو۔بیوقوف وہی احمق..... میں کسی کا انتظار نہیں کر رہی!''

گھڑے کو ہاتھ سے گرا کر وہ اٹھی اور گلی میں غائب ہو گئی وہ بے تحاشا بھاگی کیونکہ تین سال تک روزانہ اس نے اس کا انتظار کیا تھا اور اس کی راہ تکی تھی اور خود کو یقین دلایا تھا کہ عمر واپس آئے گا۔

چنار کے درخت کی آڑ سے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر لنگڑاتا ہوا اس کے پاس پتھر کے قریب آیا۔اور گڑگڑا کر کہنے لگا خدا کے نام پر محتاج کو کچھ دو!۔

نیشاپور کے مزار پر قبرستان.....سرو کے جھنڈ میں دریا کے کنارے' دوپہر کا وقت

قبرستان کی منتشر قبروں پر وہ پھولوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا اور انسانوں کی اس آخری آرام گاہ پر ایک دلفریب قالین بچھا دیا تھا۔خوشگوار دھوپ کی روشنی میں مزاروں کی لوحیں چمک رہی تھیں۔کسی پر عماموں کے نقش تھے کسی پر پھولوں کے گچھوں کے اور کسی پر کوئی نقش نہ تھا..... یہ سب قبریں عورتوں کی تھیں۔

سرو کے درختوں تلے نقاب پوش عورتیں سر جوڑے آپس میں باتیں کر رہی

تھیں۔ وہ قبروں کے قریب حلقے بنائے بیٹھی تھیں۔ انہیں بچوں کی زیادہ فکر نہ تھی۔ جو گھاس پر کھیلتے پھر رہے تھے۔

یہ جمعے کا مبارک دن تھا۔ اس دن عورتیں فاتحہ پڑھنے ٹولیاں بنا کر قبرستان آتی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ مزے مزے کی باتیں کرتیں۔ کچھ بڑی عمر کی لڑکیاں عورتوں کی ٹولیوں میں سہلتی پھرتیں اور سرو کے اس جھنڈ میں نکل جاتیں جہاں انہیں کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ عورتوں کی موجودگی میں کوئی مرد قبرستان میں آنے کی جرات نہ کرتا تھا۔ پھر بھی دریا کے قریب کچھ پگڈنڈیاں اور سبزہ زار تھے جہاں مہجور عاشق اپنی من موہنیوں کا انتظار کرتے۔

یاسمین سہلتی سہلتی آگے نکل گئی تھی۔ ایک چٹان پر لیٹی ہوئی وہ ان کبوتروں کو تک رہی تھی جو اس کے سر ہی پر اڑ رہے تھے۔ اس کے قریب ایک کھنڈر کی دیوار تھی اور ان کبوتروں کے گھونسلے اسی دیوار میں تھے۔ دیوار پر کوئی چھت نہ تھی اسے اس بلند مینار کی چار دیواری کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جس کی تعمیر غایت یہ تھی کہ وہ دریا اور قبرستان کے قریب میدان کی پاسبانی کے لیے چوکی کا کام دے لیکن پچھلے کئی سال سے ملک میں امن و امان تھا اور یہ مینار بیکار پڑا تھا اس میں کبوتروں نے گھونسلے بنا لیے تھے اور عمر کی طرح جو رات کو یہاں اکثر ستاروں کا مطالعہ کرنے آتا تھا بھولے بھٹکے لوگ یہاں ٹھہر جاتے تھے۔

یاسمین نے اپنے دل میں کہا ''ارے میں یہاں کیوں آئی ہوں؟'' دھوپ میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی طرح اس کے خیالات بھی آزادی سے پرواز کرنے لگے

یاسمین نے بڑی احتیاط سے اپنے دل میں ایسے موقع کے لیے جب اسکے پہلو میں کوئی مرد ہو، منصوبہ بنایا تھا اس نے اپنی بہن کی طرح اس مرد کو ساحرانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سامنے ایسے جذبات انگیز جملے کہنے کی مشق بھی کی تھی جو بالآخر اس مرد کو اپنا دیوانہ بنالیں گے لیکن جمعے کے اس ماتمی لباس کے اندر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اپنی زبان سے مہمل الفاظ کہے جارہی تھی۔

اور اس کے پہلو میں لیٹا ہوا شخص اتنی دیر سے خاموش تھا لیکن اس کی آنکھوں مین پیاس تھی۔

''ارے کچھ تو بولو'' یاسمین نے اس شخص سے کہا۔

''ننھی یاسمین! میں کیوں بولوں؟'' عمر نے یہ کہتے وقت اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا، لیکن اسے یاسمین کی بلوریں گردن، یاقوتی ہونٹوں اور حسین آنکھوں کی قربت کا احساس تھا۔

''کیا تم جنگ میں شامل نہیں ہوئے اور تم نے سلطان کو نہیں دیکھا؟'' اور..... پھر دوسرے شہروں میں اور بہت سی لڑکیوں کے حسن سے تم نے اپنی آنکھیں نہیں سینکیں۔ بتاؤ! تم نے اور کیا کیا دیکھا؟''

عمر اس وقت زوئی اور خراسان کی لمبی سڑک کے متعلق سوچنے لگا اس نے بے ساختہ کہا ''وہ جنگ کچھ بھی نہ تھی۔ واللہ ہم بساط کے مہروں کے مانند گردش کرتے اور پھر اپنے خانوں میں پہنچ جاتے تھے۔ جنگ کے متعلق کیا بتا سکتا ہے؟''

ایک بہت پرانی یاد کی طرح یاسمین کو سبزے پر سوار اس فاتح امیر کا خیال آیا جو

اپنے جلو میں نیزہ بازوں کا دستہ لیے آئے گا اور اسے اپنے ہمراہ سفید بطوں والے خیمے میں لے جائے گا۔

''نیشاپور میں تم کیا کرو گے؟'' یاسمین نے تعجب سے پوچھا۔

''کون جانے؟''

''کیا تم پھر واپس جاؤ گے؟''

عمر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ نہ واپس جانا چاہتا تھا اور نہ یاسمین کے علاوہ جو گزشتہ برسوں میں ایک سنجیدہ بچی کے بجائے حسین اور دلکش عورت بن گئی تھی کسی اور چیز کے متعلق سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بدلی نہیں تھی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے عمر کسی خیال میں غرق تھا اور قبرستان سے واپس جانے والوں کے ان چھوٹے چھوٹے سایوں کو تک رہا تھا جو دور شہر کے دروازوں تک پہنچ رہے تھے۔

یاسمین نے کہا ''لوگ کہتے ہیں کہ تم آئینہ دانش کے محبوب شاگرد تھے اور اب تم خود استاد جیسے معلوم ہوتے ہو''۔

عمر کو یہ بات سن کر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ یاسمین نے کتب فروشوں کی گلی میں یہ ذکر سنا ہوگا جہاں مدرسے کی باتوں کا چرچا رہتا ہے۔

اس نے ہنس کر کہا ''لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ نہ میرے پاس کام کے لیے جگہ یہ نہ میرا کوئی سرپرست ہے' اور نہ کوئی اپنی چیز ہے۔ درویش کو اپنا پیٹ بھرنے کے ڈھنگ آتے ہیں اور معلم کو اس کی روزی ملتی ہے لیکن میرے پاس کیا ہے؟''

یاسمین گھاس پر اس کے اور قریب لیٹ گئی۔ اگر واقعی عمر فقیر ہوتا تو اسے کوئی اس

سے نہ چھینتا۔ یہ اور اچھا ہوتا۔ غیر ارادی طور پر وہ عمر سے کہنے لگی۔ ''عقلمند ہونے کی بجائے تم احمد جوتشی سے بھی زیادہ بے وقوف ہو گئے ہو۔ احمد ستاروں کا حال بتا کر بہت کچھ کما لیتا ہے۔ اس کے پاس ریشمی عبا اور ایک حبشی غلام ہے..... دیکھو اب سب عورتیں جا چکیں مجھے اب جانا چاہیے!''

لیکن عمر نے اس کی کلائی پکڑ لی تو یاسمین نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبوتر مینار کے طاقوں میں بسیرا کر رہے تھے اور اب کوئی کبوتر آسمان پر اڑتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ یاسمین نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''دیکھو چاند نکل آیا ہے اب مجھے جانا چاہیے''

''جلد ہی اس ہلال کے درمیان ایک ستارہ دکھائی دے گا'' یاسمین نے قہقہہ لگا کر کہا ''نہیں میں اسے نہیں دیکھوں گی''۔

''اپنے اس عظیم مینار میں تنہا بیٹھ کر تم ہی اس ستارے کو اور دوسرے تمام ستاروں کو دیکھو گے۔ کیا تمہیں ان مردوں سے ڈر نہیں لگتا جو کفن پہنے اپنی قبروں سے باہر نکل کر یہاں بیٹھے رہتے ہیں''؟

''نہیں وہ میرے دوست ہیں۔ وہ میرے لیے فلکیات کا ساز و سامان اور ستاروں کی روشنی لاتے ہیں اور مجھے وہ علم سکھاتے ہیں جو کلدانیوں کو معلوم تھا''۔

خوف کے مارے یاسمین اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عمر تعجب انگیز عقل رکھتا ہے اور اس کی مدد سے وہ راز معلوم کرتا ہے۔ غالباً وہ مردوں سے بھی بات چیت کر سکتا ہے۔

''لیکن تم کالدانیوں کی زبان کیسے بات چیت کر لیتے ہو؟''

''نہیں یاسمین! خدا کا ایک فرشتہ اس دیوار پر آ کر بیٹھتا ہے اور مردے جو کچھ کہتے ہیں وہ مجھے سمجھاتا ہے۔ کیونکہ فرشتے دنیا کی سب زبانیں جانتے ہیں''۔

''یہ مزاق ہے! فرشتوں کے متعلق مذاق کرنا گناہ ہے۔ کیا واقعی یہاں بھوت آتے ہیں؟''

وہ عمر کے اور قریب بیٹھ گئی اور قبرستان کی قبروں کے تاریک سایے دیکھنے لگی۔ عمر نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور وہ کانپ گئی اور ایک طرف کو کھنچنے لگی۔ اس پر غنودگی سی چھا گئی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

عمر اس کے دل کی دھڑکن اور تیز سانسیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی ''مجھے ڈر لگ رہا ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے!'' الفاظ عمر کے جذبات کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ یاسمین نے اس کے چہرے کو ہاتھوں سے دبایا۔ عمر بولا ''میری طرف دیکھو!'' لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔

آسمان پر ہلال کی باریک سیمیں محراب کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی اور اسکے بیچ میں ایک ستارہ چمک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کے سیاہ پردے پر کسی نے چاند کا اور ستارے کی تصویر بنائی ہے۔ عمر کو ایک عجب تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کا تمام جسم دکھ رہا تھا۔ لیکن یہ درد اس وقت رک گیا جب اسنے یاسمین کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مس کر دیے۔

''نہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے نہیں میں.....'' یاسمین نے گہری سانس لے کر

کہا۔

ستاروں کی ملگجی روشنی میں سیاہ دوپٹے نے یاسمین کے گورے بازوؤں کو اور چمکا دیا تھا۔ یاسمین نے اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے اس کو اپنے سینے سے لگایا اور اپنے گرم ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ محبت کے جوش میں وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد بہت دیر عمر اور یاسمین آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے پھر شہر کے دروازے پر پہنچے نہ انہیں اس راستے کا احساس تھا جس پر وہ چل رہے تھے اور نہ اس ماہ نو کا جو جیچے کی طرح آسمان پر چمک رہا تھا جب وہ کتب فروشوں کی گلی مس چنار کے درخت کے نیچے چشمے پر پہنچے تو یاسمین عمر سے لپٹ گئی روتے روتے اس کا نقاب آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ وہ بولی ''جان جان! میں تجھے کس طرح چھوڑ سکتی ہوں؟''

یاسمین نے زندگی میں صرف ایک ہی بار محبت کی تھی اور اس کا ایک ہی محبوب تھا ۔جدائی کے غم سے اس کا تمام جسم شل تھا۔ یقیناً خدا کو وہ فرشتہ ویران مینار کی دیوار پر آ کر بیٹھا ہوگا۔ اور اس نے یاسمین کے جسم کی طاقت کھینچ لی ہوگی

عمر کو نہ کھانے کی خواہش ہوئی اور نہ وہ سو سکا۔ اس پر غنودگی طاری تھی لیکن اس کے حواس فسون شب سے مسحور تھے عمر اس فقیر پر جو اس کی قیام گاہ کے دروازے پر پڑا تھا مسکرایا۔ یہ وہی فقیر تھا جسے اس نے پچھلے دنوں شہر کی گلیوں میں پھرتے دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا پھر اس کے قدم خود بخود باغ کی جانی پہچانی سڑک کی طرف اٹھ گئے یہاں اس باغ میں چوکی دار مدور قندیلیں ہاتھ میں لیے خدا

کے نام پر لوگوں کو چیخ چیخکر ہر گھنٹے پر وقت بتاتے تھے۔عمر پر مدہوشی سی طاری تھی اور شب کی تاریکی میں اسے تعجب شکلیں نظر آ رہی تھیں۔اس نے ایک سایہ دیکھا جو اس کے پیچھے درختوں سے نکل کر تالاب تک گیا جہاں خانماں لوگ سو رہے تھے اور رات کے اس سحر آفریں سماں سے بے خبر نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔

ایک کبڑے آدمی کے قریب ایک سفید گدھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔یہ کبڑا اپنے بدن پر کپڑا لپیٹتا ہوا تالاب کے کنارے تک سرک کر آیا۔عمر کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہے..... جیسے اس وقت سے پہلے اس نے ان کو کبھی دیکھا ہو' لیکن اس صورت سے نہیں.....

عمر اس کبڑے کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔کبڑے نے پانی کی طرف اشارہ کر کے کہا بھائی چاند آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔عمر نے پانی میں ہلال کا نیمچہ نما عکس دیکھا۔اس رات عمر کے نزدیک رنج کی کوئی حقیقت نہ تھی۔لیکن اسے علم تھا کہ کبڑا رنجیدہ ہے۔

''تو کیا کرتا ہے؟''عمر نے نرمی سے پوچھا۔

''میں پہرا دیتا ہوں۔دیکھو! یہ دوسرے لوگ کس طرح سو رہے ہیں یقیناً میں اس چاند کی نگرانی کرتا ہوں جو پانی میں ڈوب گیا ہے۔کیونکہ اصل چاند وہی ہے اور یہ آسمان کا دوسرا چاند غیر تغیر پذیر اور بے پروا ہے۔ہاں یہ ڈوب جائے گا اور پھر نکلے گا۔گویا یہ رات بھی دوسری راتوں کے مانند ہے''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''عمر نے کہا۔

کبڑے نے خوبیدہ لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ان لوگوں کا آقا موجود ہے ایک نیا آقا لیکن میں جعفرک ہوں اور میرا آقا مر چکا ہے۔ واللہ وہ عنایتوں کا آفتاب تھا واللہ وہ بدنصیبوں کا محافظ تھا۔ واللہ وہ جعفرک جیسے بدصورت اور انتہائی ذلیل غلام سے محبت کرتا تھا۔ اب سورج کی اس زمین سے سورج اٹھ گیا۔ وفاداروں کا محافظ اور جعفرک کا محبوب چھن گیا۔ واللہ سلطان ارسلان قتل ہو گیا''۔

عمر پانی پر چاند کے رواں عکس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے جعفرک کی وکئی بات سنی اور کوئی نہ سنی وہ بولا مجھ معلوم نہیں''۔

''تمام نیشاپور جانتا ہے کہ آج ہم سمرقند سے اس کی لاش لے کر آئے ہیں۔ یہ اس کی قسمت تھی۔ میرے بھائی دیکھو اس کا اقتدار زبردست ہے! میرے اس آقا کے سامنے مرقند میں ایک ذلیل قیدی لایا گیا اور جب یہ قیدی میرے آقا کے روبرو پیش کیا گیا تو دو مضبوط جلاد اس کے بازو پکڑے ہوئے تھے۔ اس ذلیل شخص نے میرے مرحوم سلطان کو گالی دی۔ سلطان غصے سے سرخ ہو گیا اس نے اپنا تیر کمان نکالا اور جلادوں کو الگ کھڑا ہونے کا حکم دیا وہ چاہتا تھا۔ کہ اس ذلیل کتے کو اپنے تیر سے ہلاک کرے۔ وہ تیر انداز سلطان ج کا تیر کبھی خطا نہیں ہوا'' جعفرک کو پسینہ آ گیا اس نے اپنا منہ پونچھا اور آہ بھر کر کہا کہ ''لیکن اس کو وہ تیر خطا ہو گیا اور اس ذلیل کتے نے جس کے پاس دو خنجر چھپے ہوئے تھے میرے آقا پر اچھل کر حملہ کر دیا اور میرے آقا مرحوم کے پیٹ پر تین وار کیے۔ چار دن کے بعد میرا آقا اللہ کو پیارا ہو گیا''۔

''الامان'' عمر نے منہ ہی منہ میں کہا۔

جعفر ک جو فرط غم سے آگے پیچھے ہل ہل کر رو رہا تھا کہہ رہا تھا۔

''میں آنسوؤں کی چاندنی میں بیٹھا ہوں اور رو رہا ہوں''۔ عمر کو دور رات کی تاریکی میں رحیم کی قبر دکھائی دے رہی تھی اور وہ وقت یاد آ رہا تھا جب رحیم کا غلام اس کے قریب بیٹھا اسی انداز سے رو رہا تھا۔

زخمی فقیر بڑبڑایا ''دیگ کا اندازہ ایک چاول سے ہو جاتا ہے۔ نہیں وہ ابھی جوان ہے اور اس کے جسم میں شب بیداری کی طاقت ہے۔ افوہ مجھ پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا ہے۔ کیا گوشہ جمعے کی شام سے میں اس کا تعاقت نہیں کر رہا ہو؟ نہیں وہ مشکوک نہیں ہے۔ سر دست تو اس کی یہ حالت ہے کہ وہ بیل اور گدھے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا''۔

توتوش نے اس سے پوچھا ''کیا وہ لڑکی کنیز ہے؟ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

فقیر نے عیاری سے آنکھ مار کر کہا ''رات کے وقت بلی سائل نظر آتی ہے۔ لیکن وہ کنیز نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے گھر کی مستورات اس سے خاصا کام لیتی ہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے''۔

''اور اس کا نام کیا ہے؟''

''لوگ اسے یاسمین کہتے ہیں شان حسین حمام کا مالک کہتا ہے کہ مشہد کے ایک کپڑے کے تاجر ابوزید نے اس اندھے کتب فروش کو اس لڑکی کے لیے اپنا پیام بھیجا

ہے"۔

ابو زید تاجر ہے؟

"ہاں میرے آقا"۔

اس کے پاس ایک بڑا خیمہ اور اونٹ ہیں۔ تو توش یہ کہہ کر کچھ سوچتا رہا اور فقیر جسے اب تک اپنی اجرت نہیں ملی تھی ادب کے ساتھ منتظر رہا۔ پھر تو توش بولا "کم از کم ہمارا نوجوان خیام کتب فروشوں کی گلی سے نہیں جائے گا۔ تو جا اور جب تک پیغام پہنچے نگرانی کر"۔

"لیکن میرے آقا میں پیامبر کو کیسے پہچانوں گا؟"

"وہ تجھے اس طرح اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار کر کہے گا "خیال کہاں گھوم رہا ہے؟" اس وقت تو گہری نیند نہ سونا۔ دوسرے لوگوں کے بھی آنکھیں ہیں اور وہ تیرے خراٹے بھی سن سکتے ہیں"۔

"آقا وہ تیرے غلام کے نہیں ہیں....."

تو توش چل دیا۔ اس نے زمین پر تانبے کے چند سکے ڈال دیے اور فقیری جلدی جلدی اٹھانے لگا تاکہ کہیں وہ شریر بچے جو قریب ہی کھیل رہے تھے جھپٹ کر لے نہ جائیں۔ فقیر بڑبڑا رہا تھا بغدادی درہم سے زیادہ کے پیسے نہیں..... اتنی سخت محنت کا کتنا کم معاوضہ ہے افوہ یہ امیر کا بچہ تو اپنی مٹھی سے پانی بھی نہ بہنے دے"

لیکن تو توش سے ڈرتا تھا اور اس لے اور بھی زیادہ اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ موٹا اور پستہ قد آدمی کسی کا ملازم ہے۔ چنانچہ وہ جلد چنار کے درخت کے نیچے چشمے کے

قریب پتھر پر اپنی مخصوص جگہ پہنچنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ مدرسے کے دروازے پر بڑی گہما گہمی ہے۔ لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے لوگ اپنے غلاموں کے ہمراہ آ جا رہے ہیں اور گلی کے آخر میں میدان کے قریب سے سواروں کے قافلے گزر رہے ہیں۔ نیشاپور کے باشندوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ اب قسمت کیا رنگ لاتی ہے۔ سلطان تو مر چکا تھا حالانکہ شہر میں اس کا معقول سوگ منایا جا رہا تھا۔ لیکن جامع مسجد میں مولوی اپنے خطبوں میں نئے سلطان یعنی **ملک** شاہ کا نام لے رہے تھے۔ **ملک** شاہ نوجوان اور خوبصورت شہزادہ تھا۔ اور لوگ اسے شیرزادہ کہتے تھے۔

ملک شاہ جس کے چہرے پر ابھی پوری طرح سبزہ آغاز بھی نہ ہوا تھا اور جو ابھی مدرسے کتابوں اور شہسواری کے ماحول میں زندگی گزار رہا تھا یکایک ناصر الملۃ والدین سلطان الشرق والغرب اور دنیا کا آقا بن گیا تھا امرائے خراسان اسے نذریں پیش کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

فقیر یہ سب تماشا بے توجہی سے دیکھ رہا تھا' کیونکہ اسے تو عمر اور یاسمین کی فکر تھی۔ دن میں وہ شاذ ہی نظر آتے تھے لیکن جب چشمے پر رات کی تاریکی چھا جاتی تو آنے جانے والوں کی نگاہوں سے بے نیاز باہر اندھیرے میں دو سائے نظر آئے۔

فقیر سوچتا تھا کہ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے وہ اچھی طرح نقاب میں چھپی ہوئی ہے اور وہ بھی ان سینکڑوں انسانوں کے مانند ہو گی جو شام کے وقت غپ لڑانے' تفریح کرنے اور قسمت کے کرشمے دیکھنے کے لیے نکلتے ہیں ورنہ اسے دیکھتا

اور پہچانتا۔

عمر کے متعلق اس کا یہ خیال تھا کہ یہ بلند قامت نوجوان ہوش و حواس کھو چکا ہے۔ صرف بھولے سے کبھی کبھی مسجد کے ہجوم میں زائروں کے ساتھ کھانا کھانے کا خیال آجاتا تھا۔ وہ چشمے پر پانی پیتا تھا اور کسی سے بات نہ کرتا تھا۔

فقیر کو عمر کی حالت پر رشک آتا تھا وہ سوچتا تھا کہ ''عمر اس شرابی کی مانند مست رہتا ہے جو ہر رات شراب کا قرابہ پی جاتا ہو۔ لیکن اسے اس نشے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی خرچ نہیں کرنی پڑتی''۔

دوسرے دن ایک قلی آیا اور اس نے فقیر کے سینے پر ٹھوکر مار کر کہا کہ ''جوؤں کو پالنے والے وہ تیرا خیام کہاں گھومتا ہے؟''

''اے آوارہ گرد! میں کسی کا پالنے والا نہیں'' فقیر نے غصے کی نظر سے نووارد کو دیکھا اور یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف ایک ایسا ملازم ہو سکتا ہے جسے کسی بھنگی نے ایک بے حیا اور چڑیل خصلت کمینی..... عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے.....''۔

قلی نے فقیر کو ایک ٹھوکر اور لگائی تو وہ خاموش ہو گیا وہ بڑبڑایا ''تجھے کس نے بھیجا ہے؟''

''اس نے جو تیری لاش کو محل کے دروازے پر لٹکا کر چیل کوؤں کو کھلا سکتا ہے''

''عمر خیال سامنے شان حسین نام کے حمام میں ہے۔ خدا گواہ ہے اگر میں حمام والے کو ایک درہم دے سکتا تو میں بھی اس حمام میں جاتا.....''

قلی نے اسے یہ انعام دیا کہ اس کے کاسے میں تھوک کر چلتا بنا اور فقیری غصے

میں پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔

'خدا کرے تیری قبر پر کتیا بچے دے! خدا کرے عقاب تیری ہڈیاں کھائیں! خدا کرے جہنم کی آگ تیری چربی پگھلائے!'' فقیر گڑگڑا کر اسے بددعائیں دینے لگا۔

عمر اس قلی کے ہمراہ قصر سلطانی کے پہلے صحن میں پہنچا۔ جہاں تقریباً نصف درجن امراء کے مسلح دستے اپنے سجے ہوئے گھوڑوں کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے یہاں توتوش کو دیکھا جو انتہائی بے صبری کے عالم میں تھا۔ وہ عمر کو دیکھتے ہی چیخ پڑا۔ اس نے جلدی سے عمر کو آستین پکڑی اور محافظوں اور چوبداروں کے درمیان سے نکلتا ہوا جو سب اس نیلے عمامے اور لمبی عبا والے انسان کو خوب پہچانتے تھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں بیٹھنے کے لیے میز کرسی نہیں تھی۔

اس نے عمر سے کہا ''خدا کی قسم مقررہ وقت گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی اس نے تجھے بلایا نہیں ہے'' پھر اس نے عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھا اور بولا ''کیا تجھے معلوم ہے کہ نظام الملک نے تجھے کس لیے اپنے حضور میں یاد کیا ہے''؟

عمر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔..... اسے بہت زیادہ تعجب ہو رہا تھا۔ نظام الملک..... دنیا کا ناظم''۔ اس شخص کا کتاب ہے جو الپ ارسلان کا وزیر تھا اور جس کا مقتول سلطان کے جانشین ملک شاہ پر بھی اتنا ہی اثر تھا۔ پھر سلطان کے عہد حکومت میں نظام الملک کو تقریباً سیاہ و سفید کے اختیارات مل گئے تھے۔ وہ ایک ذہین اور دانش مند ایرانی تھا۔ جس نے فوج کے علاوہ بتدریج ملک کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا تھا۔ یہ تعجب انگیز بات تھی کہ اس نے مدرسے کے ایک طالب علم کو اپنے حضور میں کیوں یاد کیا ہے؟

توتوش نے اس راز پر کوئی روشنی نہ ڈالی۔ وہ کچھ سوچ کر بولا ''میں نے باب طاقین پر تیری خودداری کو ٹھیس لگائی تھی یہ ایک آزمائش تھی۔ اور نظام الملک کے حکم سے میں نے تیری نگرانی بھی کرائی تھی''۔

عمر نے اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا وہ کہہ رہا تھا..... ''اور میں نے تجھ پر پہرا بھی لگایا تو نوجوان اور بے نیاز ہے لیکن اب اس وقت نظام الملک خود تیرا امتحان لے گا اس لیے ذرا احتیاط سے کام لینا''۔

عمر اس کی باتیں تو سن رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ یہ بیکار سی باتیں معلوم ہوتی تھیں..... تاوقتیکہ شیر زادہ جو اب سلطان بن گیا تھا اسے طلب نہ کرتا لیکن شیر زادہ تو دور جنگلوں میں شکار کھیل رہا تھا اور خلا میں یاسمین کی پیاسی نظریں اسے دیکھ رہی تھیں۔

یکا یک ایک غلام نے سامنے سے بھاری پردہ گھسیٹا۔ اب عمر کو معلوم ہوا کہ یہ خالی کمرہ اصل میں ایک بڑے دیوان خانے کا بیرونی حصہ تھا جس کے اندر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دالان کے وسط میں ایک ۶۰ سالہ انسان تنہا بیٹھا ان کاغذوں کو دیکھنے میں مصروف تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی بھوری ڈاڑی کے بال جن میں سلیقے سے کنگھی کی گئی تھی اس کی ریشمی عبا پر پڑے تھے اور وہ کچھ لوگوں سے مختصر باتیں کرتا اور ان میں سے ایک شخص کو جو اس کا معتمد معلوم ہوتا

تھا کاغذات دیتا جاتا۔ جو لوگ اس سے رخصت ہو کر سر جھکائے الٹے قدموں دیوان خانے کے دروازے کی طرف جاتے وہ ان کا سلام قبول کرتا۔

تو توش اپنے ساتھ عمر کو لے کر آگے بڑھا۔ وہ ایک بار سلام کرنے رکے اور پھر نظام الملک کے سامنے پہنچ کر قالین پر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر تک نظام الملک اپنے گھنے ابروؤں میں سے عمر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کے کاغذوں کو دیکھا۔ اور کہا ''تم ابراہیم خیام کے بیٹے ریاضی کے طالب علم اور استاد علی کے شاگرد ہو؟ اور بچپن میں تم نے امام موفق سے فلسفہ پڑھا تھا؟''

نظام الملک ایسی جچی تلی اور چست آواز میں بول رہا تھا کہ جیسے وہ شخص بولتا ہے جو بڑے مجمعوں میں گھنٹوں تقریر کر سکتا ہے۔ تو توش کاموش علیحدہ بیٹھا ہوا تھا۔

''استاد علی نے لکھا ہے کہ تم میں ایک عجیب و غریب طاقت کے مالک ہو۔ اللہ کے سوا کوئی طاقتور نہیں۔ میں ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کسی روحانی طاقت کے زور سے ہمارے آقا سلطان ملک شاہ سے اس زمانے میں جب وہ شہزادے تھے ملازگرد جنگ کے انجام اور قیصر روم اور ہمارے مرحوم سلطان دونوں کے مارے جانے کی پیشن گوئی کی تھی؟''

عمر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ کاش اس کے جواب میں وہ کوئی قرین قیاس قصہ سنا سکتا لیکن عمر کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ شخص جس کی نگاہیں تیز اور آواز سخت ہے کسی من گھڑت بات کو فوراً مسترد کر دے گا۔

اس نے ہمت کر کے کہا ''عالی جاہ حقیقت میں ..... یہ پیشن گوئی ایک مذاق

تھی''۔

نظام الملک نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوال کیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ سمجھا وہ مذاق نہیں ہو سکتا تھا۔

عمر کو اب اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے جو واقعہ ہوا تھا وہی بتایا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ مذاق ہی تھا عالی جاہ! اس رات میں خیموں کے باہر گھوم رہا تھا اور اتفاقاً اس خیمہ کی طرف جا نکلا جہاں ترکوں کا پہرا تھا۔ میں ان کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا..... اور نہ یہ مجھے احساس تھا کہ اس خیمے کا نوجوان امیر شہزادہ ہے۔ اس کے پاس جو استاد تھے انہوں نے سہل ستارہ دکھانے میں سخت غلطی کی۔ اس وقت اتفاق سے مجھے یہ خیال آ گیا کہ انہی کی طرح سنجیدہ انداز میں ایک پیشن گوئی بھی کر ڈالوں یہ تھی ساری بات''۔

نظام الملک گاؤ تکیے سے کمر لگاتے ہوئے بولا ''تم بدتمیزی کی حد تک صاف گو ہو۔ تم اس بات کا کیا جواب دو گے کہ اس مذاق میں تین واقعات کے متعلق صحیح پیشن گوئی کی گئی۔ یعنی جنگ اور دونوں بادشاہوں کے مارے جانے کے واقعات؟''

عمر ایک منٹ کے لیے سوچتا رہا اور اس نے کہا ''عالیجاہ میں اس کی تشریح کر سکتا ہوں اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہی ہے!''

نظام الملک نے عمر کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ ایک بے جان شے ہے اور اس کی جانچ کی جا رہی ہے ''اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا میں جاننا چاہتا ہوں کہ کس چیز نے تجھے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔ یقیناً تجھے قیصر روم کی پیدائش کا دن اور وقت معلوم

نہ تھا۔ تجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت کون سا ستارہ غالب تھی۔ پھر تو نے سلطان الپ ارسلان کا زائچہ کس طرح ترتیب دیا ہوگا؟''

تو توش نے خود ہی آنکھ ماری جیسے وہ نظام الملک کی چال کو سمجھ رہا ہو۔

عمر نے جواب دیا ''میں نے زائچہ نہیں بنایا تھا''۔

''لیکن تم میں زائچہ بنانے کی قابلیت ہے''۔

''یقیناً یہ قابلیت تو اور بھی سینکڑوں انسان رکھتے ہیں''۔

نظام الملک کی بھنویں سکڑ گئیں اس نے کہا ''ممکن ہے لیکن مجھے ابھی تک ایسا کوئی نجومی نہیں ملا جو بیک وقت تین پیشن گوئیاں کر سکے۔ اور پھر استاد علی کی رائے ہے کہ تم کسی عجیب و غریب طاقت کے مالک ہو''۔

تو توش اپنی جگہ نظام الملک کے اس جملے کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اسے نظام الملک نے یہ حکم دیا کہ عمر خیام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرے۔

نظام الملک نے اچانک عمر سے یہ سوال کیا ''ابراہیم کے بیٹے کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد ملک شاہ تجھے کئی مرتبہ پوچھ چکا ہے؟''

''نہیں میں نے نہیں سنا''۔

نظام الملک اور تو توش دونوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ نظام الملک مطمئن نظر آتا تھا حالانکہ اس نے اس کا کوئی اظہار نہ کیا۔ وہ بولا ''ابھی تو نو عمر ہے اور سلطان کے حضور پیش ہونے کا اہل نہیں اور چونکہ تیری پیشن گوئی صرف ایک مذاق تھی اس لیے تجھے اس کے حضور نہایت احتیاط برتنا پڑے گی۔ میں تجھ سے یہ بات

چھپانا نہیں چاہتا کہ ملک شاہ تجھ سے عنایت سے پیش آئے گا۔ لیکن وہ باتیں جو تو نے مجھے اس کمرے میں کہی ہیں تیری موت کا باعث نہیں تو تیری ذلت کا باعث یقیناً بن جائیں گی..... اپنی اس عجیب وغریب پیشن گوئی کے صلے میں تو سلطان سے کیا انعام مانگے گا؟''

عمر اس سوال پر شرما گیا وہ سوچ رہا تھا کہ اس رات کا ایک درہم اس کے لیے عذاب جان بن گیا ہے۔ اس نے جواب دیا ''مجھے سلطان کے دربار سے کیا واسطہ؟ مجھے کسی انعام کی تمنا نہیں ہے''۔

نظام الملک کو عمر کی اس بات پر پورا یقین نہ آیا۔ وہ سلطان کے دربار کے طور طریقوں سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے مناسب سمجھا کہ اس ضدی نوجوان کو سمجھائے۔ وہ بولا ''میں وزیر ہوں اور ملک شاہ کا خادم! مجھے تجھے اپنا دوست بناؤں گا..... کیونکہ تجھے کسی انعام کی تمنا نہیں ہے۔ ابراہیم خیام کے بیٹے! بتا کہ کیا تجھے اپنی زندگی اور اپنے علم کے لیے نظام الملک کی حفاظت اور سرپرستی قبول ہے؟''

اس سنجیدہ اور شریف انسان کو عمر نے انتہائی تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اس پر آئینہ دانش کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور پچھلے دنوں وہ فقیروں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا اس کے دل میں یہ تمنا تھی کہ کاش یاسمین کو رکھنے کے لیے اس کے پاس مکان ہوتا۔

عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ جلدی سے بولا ''جی ہاں یقیناً''۔

پھر بتا تجھے کس چیز کی ضرورت ہے''؟

''ایک رصد گاہ بغداد کا بنا ہوا 1-1/2 گز قطر کا اسطرلاب افلاطون کی جدول

''اور کیا بتائے جاؤ''۔

''اگر عالی جاہ مناسب سمجھیں تو چمکدار پیتل کا ایک کرہ ج کے گرد افقی حلقے ہوں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے لالٹین اور اگر ہو سکے تو پانی کی گھڑی جو دو دو منٹ کا وقت ٹھیک ٹھیک بتا سکے''۔

تو توش تعجب سے آنکھیں پھاڑے ان قیمتی اور کمیاب آلات کی فہرست سن رہا تھا۔ لیکن نظام الملک نے اسے ان چیزوں کی فہرست بنانے کا اشارہ کیا۔

پھر نظام الملک نے مسکرا کر پوچھا ''اور یہ رصد گاہ کہاں ہوگی؟

کیا کسی اونچی چھت کے اوپر؟''

عمر نے جلدی جلدی سانس لیے بغیر کہا ''عالیجاہ کی دانشمندی سے نیشاپور جنگ کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہے اور اس کی سڑکوں کے کنارے پاسبانی کے پرانے مینار ویران پڑے ہیں۔ قبرستان اور دربار کے قریب شہر پناہ سے آگے ایسا ہی ایک منارہ ہے اور میں نے اکثر اس منارے سے رات کے وقت ستاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا یہ منارہ مجھے مل سکتا ہے۔ اور کیا اس کے دروازے پر ایک عمدہ تالا بخارا کے چند اچھے قالین تکیے اور ایک چینی پردہ اور چاندی کی ایک صراحی بھی مجھے مل سکے گی؟

نظام الملک نے متعجب ہو کر کہا واللہ فلکیات کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی ..... عمر کی تعریف سے وہ

خوش ہو گیا اور اس کی درخواست کے خلوص سے بھی متاثر تھا..... تجھے یہ سب چیزیں عطا کی جائیں گی مگر ایک شرط پر....."

عمر نے جھک کر نظام الملک کے دو بلے ہاتھ اپنے ماتھے پر رگڑے اور نظام الملک نے کہا "اس شرط پر کہ تم کسی شخص سے بھی یہ نہ کہو گے کہ تم نے ملازگرد میں جو پیشن گوئی کی تھی وہ مذاق تھا"

"عالی جاہ! میں ایسا کبھی نہیں کہوں گا"۔

تو توش نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "اگر تم کسی سے بھی اس کا ذکر کرو تو یہ کہنا کہ وہ پیشن گوئی ایک وجدان کا نتیجہ تھی"

عمر نے ہنس کر کہا بہتر جیسا آپ کا ارشاد۔ نظام الملک مزاحیہ انداز میں بولا "تجھے چینی پردہ اور چاندی کی صراحی تو یاد رہی لیکن کھانے اور ملازمون کا کوئی خیال نہ آیا لے یہ چاندی کے سکوں کا کیسہ ہے۔ اور تو توش تیرے لیے دو ملازم تلاش کر دے گا"

یہ واقعہ تھا کہ عمر کو ان چیزوں کی پرواہ نہ تھی۔ اس نے تعجب سے اس خوبصورت کیسے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ آج سے پہلے اس نے اپنی زندگی میں مٹھی بھی روپے نہ دیکھے تھے اور اس وقت اسے عجب اطمینان و مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

عمر نے پوچھا منارہ مجھے کب ملے گا؟

نظام الملک نے تو توش کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ بھینچ کر بولا "کل عصر کی نماز کے وقت تک"۔

عمر سوچ رہا تھا کہ یہ اقتدار کا زور جادو کے کرشمہ دکھا سکتا ہے اس نے خوش ہو کر بلند آواز سے کہا ''خدائے رحیم لائق تحسین ہے'' وہ قالین پر مودبانہ کھڑا تھا جب نظام الملک نے اسے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ تو وہ نقدی کے کیسہ کو بھول کر چلنے لگا۔ تو توش نے آہستہ سے اسے یاد دلایا اور وہ جلدی سے کیسہ لینے واپس آیا تو توش نے اسے آہستہ سے یہ بھی یاد دلایا کہ واپس ہوتے وقت دروازے پر پہنچ کر اسے پھر سلام کرنا ہے۔

جب تو توش اور نظام الملک تنہا رہ گئے تو توش نظام الملک کے قریب جھک کر بولا ''آفتاب عنایات کیا میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا کہ یہ نوجوان صحیح آلہ کار ثابت ہوگا اور وہ آپ کے قبضے میں آچکا ہے؟ کیا ہمیں تمام نیشاپور میں اس جیسا دوسرا آدمی مل سکتا تھا؟ اس کی عجیب وغریب لیاقت' سچ بولنے کی اس سے بھی زیادہ عجیب عادت ستاروں کے مطالعے کے علاوہ اور تمام باتوں سے بے پروائی اور پھر اس کی وہ ناقابل یقین پیشن گئی کی صحت کیا اس نوجوان کو وہ کام انجام دینے کا اہل نہیں بتاتیں؟ معاذ اللہ اس نے تو استاد علی سے یہ قسم بھی کھائی کہ شاہی منجم کو حقیقت حال کا تعین کرنا چاہیے'' نظام الملک مسکرایا تک نہیں وہ بولا۔ ''کاش میں اس کا راز جان سکتا..... اور پھر وہ کچھ چھپاتا بھی تو نہیں''۔

نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ نے جواب دیا'' کچھ نہیں! اور پھر اس کا ہر قول صحیح ثابت ہوتا ہے اور ہر لفظ سچ میرے خدا'' تو توش نے بے پروائی سے اپنی تسبیح گھمائی اور بولا میں اسے حجتہ الحق کہا کروں گا۔ اسے استادوں کی سی عبا پہناؤ

تھوڑا سا پراسرار بننا سکھاؤ اور سب سے زیادہ اسے خاموش رہنا بتاؤ پھر اسے ملک شاہ کے حضور یہ کہہ کر پیش کرو کہ یہ ہے عمر خیام جس نے ملازگرد کی پیشن گوئی کی تی..... خدا کی شان ہے کہ میں نے اسے دنیا میں ڈھونڈ نکالا خدا میرے گناہ معاف کرے یہ بات کتنی مناسب نظر آتی ہے۔

نظام الملک جو کچھ سوچ رہا تھا" آخر وہ بے لگام بچھیرے کی طرح عمل کر رہا تھا لیکن ایک بر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ہماری مخالفت کرے گا"۔

"نہیں نہیں وہ لڑکا تو عشق میں مبتلا ہے..... جب اس کی محبوبہ اس کے پہلو میں نہیں ہوتی تو وہ اس کے تصور میں غرق رہتا ہے....."

تو توش بولتے بولتے ایکدم رک گیا کیونکہ نظام الملک نے اس کی گفتگو میں دلچسپی لینی ختم کر دی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اسلامی عقائد کا سختی سے پابند تھا۔

نظام الملک نے کہا غالباً اس کی خفیہ طاقت خدا کی دین ہوگی۔ ایسے لوگوں کو یہ جانے بغیر کہ انہیں کس طرح علم ہوا حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے"۔

"درست ہے درست ہے اللہ غیب کا علم رکھتا ہے"۔

"میری سمجھ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا کہ اس کی پیشن گوئی معجزہ تھی"۔

"صحیح ہے بالکل درست ہے۔ تو توش نے فوراً جواب دیا وہ معجزوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ اپنے ممتاز عربی کے سامنے اپنے ان خیالات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ وہ سوچ کر تعجب کر رہا تھا کہ اگر حجۃ الحق یعنی عمر پیشن گوئیاں کرنا سیکھ لے اور اس کی پیشن گوئی درست ثابت ہو تو کیا نتیجہ ہوگا۔ پھر اس نے اپنے دل

میں کہا کہ عمر خود یہ تسلیم کر چکا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا اور اس وقت بوڑھا نظام الملک خود کو یہ باور کرا رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے ماشاءاللہ ماشاءاللہ.....

".....میرا دماغ خالص ذہنی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہیں بنا ہے"۔

تو توش نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ جذامی فقیر کو کسی اور جگہ بھیجے گا اور عمر کے منارے میں ملازم رکھنے کے لیے کسی سمجھ دار شوہر اور بیوی کو جو معتبر جاسوس بن سکیں منتخب کرے گا۔

کتب فروشوں کی گلی میں چشمے پر یاسمین پانی کا گھڑا بھرنے کے بہانے آئی ہوئی تھی اور عمر بڑے اشتیاق کے عالم میں آہستہ آہستہ اس کے کان میں کہہ رہا تھا "جان من بالآخر اور انجام کار میرا پاس تیرے رہنے کے لیے ایک مکان کا بندوبست ہو گیا ہے جس کا تنہا مالک میں ہی ہوں۔ تیرے ہونٹوں کے لیے جو شراب سے زیادہ رسیلے ہیں میرے پاس شراب میں بھیگے ہوئے انگور اور تجھ کھلانے کے لیے مٹھائیاں موجود ہیں.....اور.....خدا کا شکر ہے کہ تو میرے پاس ہو گی"

یاسمین نے آہستہ سے جواب دیا لیکن وہ تو ویران جگہ ہے" اور وہاں کھانا بھی تھوڑا ہے۔ لیکن اس ویرانے میں بھی تو میرے قریب ہو گا تو میں اتنی خوش رہوں گی کہ سلطان بھی اپنے محل میں اتنا خوش نہ رہتا ہو گا"۔

دریا کے ساحل پر قبرستان کے نزدیک منارہ جواب رصد گاہ بن گیا ہے

جہاں تک منارے کا تعلق تھا تو توش نے اپنے وعدے کی پابندی کی۔ دوسرے روز مغرب سے پہلے اس نے عمر کو اس کی نئی رصد گاہ کی کنجیاں دے دیں۔ اور اس کے بعد کئی دن تک بڑھئی اور معمار اس منارے اور اس کی بیرونی دیوار کی مرمت کرنے میں مصروف رہے..... وہ دریا کے کنارے اینٹیں بناتے اور انہیں دھوپ میں سکھاتے تھے۔

عمر کو دلی خوشی ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ جب یاسمین پہلی بار اس سے منارے میں ملنے آئے تو وہاں اور کوئی نہ ہو۔ اس نے مزدوروں کو منارے کی پہلی منزل پر دیواروں پر سفیدی کرنے کا حکم دیا اور اس منزل میں ایک برسی دری بچھا دی گویا اس کی رصد گاہ میں اس منزل کو ملاقات کے کمرے کی حیثیت حاصل ہوگی۔

دوسری منزل پر اس نے بہترین قالین بچھا دیا۔ اور ایک چینی پردہ جس پر ایک اژدھے کی تصویر بنی تھی دیوار پر ٹانگ دیا۔ اس جگہ اس نے اپنا بستر بچھایا اور ایک کونے میں صندل کی لکڑی کا ایک نقیشن صندوق قرینے سے رکھ دیا۔

تیسری منزل کو اس نے خالی رکھا۔ بجز اس کے کہ وہاں کچھ تپائیاں اور چند خانہ دار میزیں مسودے کے لیے ڈال دیں۔ آلات پہنچنے کے بعد عمر کو اس منزل میں اپنا تحقیقی کام شروع کرنا تھا۔ تو توش عمر کے لیے بہت سی کتابیں بھی لایا جو نظام الملک نے تحفتہ بھیجی تھیں لیکن عمر نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ یہ اس کی ضرورت کی کتابیں اور آلات بغداد کے علاوہ اور کہیں سے نہ مل سکیں گے۔

لیک کام کرنے میں عمر کا دل بالکل نہ لگتا۔ نظام الملک نے جو چاندی کے سکوں کا کیسہ اسے دیا تھا وہ اس رقم سے گھنٹوں نیشاپور کے بازار سے چیزیں خریدتا۔ اس نے سفید ریشمی کپڑا خریدا کیونکہ اس نے سوچا کہ جب بالآخر یاسمین اس کی بیوی بن جائے گی تو گھر کے اندر وہ سفید لباس پہنے گی۔ اس کے علاوہ چینی کے مرتبانوں میں بھرے ہوئے مربے خوشبو کے لیے اگر اور اسے جلانے کے لیے پیتل کا عود دان اور یاسمین کے لیے چاندی کے بازو بند بھی خریدے جن پر نہایت حسین نیلے رنگ کی مینا کاری تھی۔

ارے یہ تو جادو ہے جب یہ تحفے عمر نے یاسمین کے سامنے رکھے تو وہ چونک کر بولی۔

عمر نے جواب دیا ''اے دشمن صبر و شکیب تو بھی ساحرہ ہے''۔

یاسمین نے آہستہ سے تالی بجائی اور عمر کا ہاتھ اپنے بازو بند سے لگا دیا۔ وہ دم بخود تھی اس نے فرش پر بچھے ہوئے چوڑے قالین کو بغور دیکھا..... کیونکہ خراسان میں ان چیزوں کا وجود اچنبھے کی بات تھی..... اس وقت بھی جب عمر اس کے نرم بالوں کو اپنے ہاتھ سے اس کی گردن سے ہٹا رہا تھا اور جب اسکی نبض تیزی سے چل رہی تھی یاسمین پردے پر اژدھے کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ یاسمین کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں فرط خوشی سے آنسو تیر رہے تھے۔

یاسمین نے کہا ''اوپر کی منزل میں تم نے اتنی بہت سی کتابیں کیوں جمع کر رکھی ہیں۔ یہ ساری کتابیں پڑھتے ہو؟ یاسمین جب کبھی عمر کو چھوڑ کر جاتی تو اسے ڈر لگتا تھا

..... خاموشی اور جدائی کا وہ وقفہ اسے بڑا ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا جو عمر سے دوبارہ ملاقات کے درمیان حائل رہے گا۔ یاسمین یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ عمر اس درمیانی عرصے میں کیا کرتا ہے۔

عمر نے بے توجہی سے جواب دیا ''نہیں بس اک چھوٹی سی نظموں کی کتاب جو ایک ریگستانی باشندے نے لکھی ہے اور میں نے پڑھی ہے''۔

''نظموں کی کتاب؟'' یاسمین نے متعجب ہو کر کہا۔ اس نے وہ منظوم کہانیاں سنی تھیں۔ جن میں شاعروں نے قدیم بادشاہوں کی لڑائیوں اور گھڑ دوڑوں کے قصے بیان کیے تھے۔ اس نے عمر سے پوچھا:

''کیا اس کتاب میں کوئی محبت کا گیت ہے؟' اس میں تو محبت کا اتنا بھی ذکر نہیں جتنی وہ میرے دل کے ایک گوشے میں موجود ہے۔

عمر نے کہا اور یاسمین کا ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اٹھایا حتیٰ کہ اس کی نظریں عمر کی نظروں سے چار ہو گئیں۔ اور ہر بار اس طرح نظریں چار کرنے کے بعد یاسمین کو عمر سے مل کر کچھ پریشانی سی ہوتی تھی۔

''چھوڑو بھی مجھے شرم آ رہی ہے'' وہ آہستہ سے بولی

''تو شیریں سے بھی زیادہ حسین ہے''۔

''کیا یہ بات اس کتاب میں لکھی ہے؟''

''واللہ لکھی ہے میرے دل کی کتاب میں لکھی ہے''

''اور میرے دل کی کتاب میں کیا لکھا ہے؟'' یاسمین نے مسکرا کر کہا کہ وہ عمر

کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

تیرے دل کی کتاب میں جفا کاری' اور میرے لیے نفرت تیرا دل ایک پتھر ہے جسے عمر کی مصیبتوں کا ذرا بھی احساس نہیں۔

یاسمین سوچ رہی تھی کہ میرا محبوب روحانی طاقت رکھتا ہے۔ یقیناً اسے قدیم علوم کے راز معلوم ہیں۔ اور وہ ان نظموں کو بھی پڑھ سکتا ہے جو قدیم شاعروں نے گائی تھیں۔ چنانچہ اس نے میرے اور صرف میرے لیے اس ویران منارے کو بہشت بنا دیا ہے۔ لیکن جب تک عمر وہ عمر ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے ی سب باتیں فضول ہیں۔ وہ یہ سوچ کر مسرور ہوئی اور ایک سرد آہ بھر کر قالین پر لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور وہ نیم باز سرمگیں آنکھوں سے عمر کو دیکھ کر بولی ''سچ سچ بتاؤ کیا میں واقعی جفا کار ہوں:'' پھر وہ آہستہ سے بولی ''ہاں بتاؤ کیا میں تم سے نفرت کرتی ہوں؟''

عمر بے قابو ہو گیا وہ یاسمین کے برابر لیٹ گیا۔ مدہوشی کے عالم میں وہ اس سے لپٹ گیا۔ اس کی ان عرب اجداد کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا جنہوں نے صدیوں تک گرم اور ویران ریگستانوں میں زندگی بسر کی تھی اور جو بنجر زمین اور گرگ صفت دشمنوں سے مقابلہ کرتے کرتے انتہائی حساس اور اس کے فولادی عزائم کے مالک بن گئے تھے۔ یاسمین کی محبت کا شدید جذبہ اسے دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

یاسمین کے خیال میں اس محبوب منارے کا کوئی نام ہونا ضروری تھا۔ نیشاپور کے لوگ کہتے تھے کہ سامنے کے قبرستان سے مردے نکل کر اس منارے میں جمع ہو

تے ہیں۔لیکن اپنے محبوب کے ساتھ یاسمین ان آوارہ روحوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔پھر بھی ایک قدیم روایت کے خیال میں اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ اس منارے کا کچھ نام ضرور ہونا چاہیے اور جب عمر اس کا کوئی نام تجویز کرتا تو وہ ہنس پڑتی۔وہ سمجھتی تھی کہ عمر کس وقت مذاق کرتا ہے۔

وہ کہتی ''نہیں نہ یہ مسکن رحمت ہے نہ کسی حور کا قصر نگاریں۔میں تم سے کہت ہوں کہ یہ ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ.....''

''ہبط ملائک؟''

''بالکل نہیں'' یاسمین کہتی اگرچہ اسے دل میں یہ یقین تھا کہ وہاں کوئی نیک فرشتہ مقیم ہے جس نے عمر کے اور اس کے دل میں محبت ڈال دی ہے پھر وہ یہ بات کہنے سے ڈرتی تھی یاسمین نے کہا ''یہ ستاروں کا گھر ہے..... یقیناً میرے پیارے کیا تم ستاروں کا مطالعہ کر کے لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کی تقدیر میں کیا لکھا ہے؟''

عمر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''میں؟ میں کون ہو؟''

ارے یہ تو شہر کے تمام بازاروں اور حماموں تک میں مشہور ہے کہ.....تم نے ہمارے سلطان ملک شاہ کی تخت نشینی کی پیشن گوئی کی تھی۔کیا تمہیں خبر نہیں ہے.....؟''

یاسمین اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا محبوب بادشاہوں تک کی قسمت کا حال بتا سکتا ہے۔اس کے علاوہ منارے میں بھی اس کا یہی کام ہونا چاہیے۔یاسمین

کے خیال میں فلکیات کی ابتدا اور انتہا زائچہ ترتیب دینا ہی تھی۔

عمر نے طوعاً و کرہاً یاسمین سے اس بات کا اقرار کرلیا کہ وہ پیشن گوئی کرنا جانتا ہے۔

یاسمین بولی ''تب تو یہ بات صحیح ہے اور جلد ہی غالباً آئندہ مہینے کے آخر تک تمہیں ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے آلات اور مزید رقم مل جائے گی اور پھر تم میرے باپ کے پاس ایک شہرت یافتہ آدمی کی حیثیت سے میرے مہر کی رقم لے کر پہنچو گے اور پھر ہم دونوں کا عقد ہو جائے گا۔

عمر کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے سارا روپیہ یاسمین کے لیے ضرورت کی چیزیں خریدنے پر صرف کر دیا تھا۔ لیکن وہ چیزیں خریدتے وقت اس کے ذہن میں کسی اور بات کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ عمر نے کہا ''ہاں ہاں بہت جلد..... لیکن میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی جو تمہارے مہر کے لیے کافی ہو.....؟''

یاسمین نے اسے سمجھایا۔ بیوقوف ہو تم اگر تم وزیر اعظم نظام الملک کے نجومی ہو تو میرے گھر والے تم سے ادائے مہر پر زیادہ اصرار نہ کریں گے۔ میری خواہش ہے..... میں چاہتی ہوں کہ یہ بات طے ہو جاتی اور تمہارے گھر میں رہتی اور مجھے پھر کبھی باہر نہ جانا پڑتا'' وہ متفکر سی ہو کر بولی ''جب تک ایسا نہ ہو گا میں زندہ نہیں رہ سکتی''۔

عمر بولا ''پھر یہیں ٹھہر جاؤ نا''۔

یاسمین کے ہونٹ کانپنے لگے اس نے جواب دیا ''یہ میں کیسے کر سکتی ہوں۔ شادی کے بغیر جو عورت کسی کے ساتھ چلی جاتی ہے اسے لوگ بھاگی ہوئی عورت

کہتے ہیں۔اور یہ بری بات ہے میں شاید..... بے انتہا مسرور ہوں اور اب میں مسجد میں اللہ تعالیٰ سے رحم کی التجا کروں گی کیونکہ میں نے اس مسرت کے سوا آج تک کسی اور خوشی کا خیال نہیں کیا''۔

لیکن عمر اس وقت مسجد کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا۔اسے اس وقت اس سبزہ زار پر جس کی ڈھلان قبرستان میں سرد کے جھنڈ تک پہنچی تھی صبح کے سورج کی کرنیں بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں۔اور اسے اپنے کمرے کے ہر گوشے سے یاسمین کے معطر جسم کی خوشبو آ رہی تھی..... یاسمین دوسرے روز نہ آئی تو وہ بے چینی دور کرنے کے لیے اپنی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔اس نے نظم کی کتاب کی وہ رباعیاں پڑھنا شروع کر دیں جو کتاب کے صفحات پر اس طرح منتشر تھیں جیسے سبزے پر پھول بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک خالی صفحہ پر اس نے اپنے کہے ہوئے اشعار لکھے۔ اس نے ایک رباعی کہی۔

در فصل بہار اگر بتے حور سرشت
یک ساغر مے دہد مرا بر لب کشت
ہر چند بہ نزد عام ایں باشد زشت
سگ بہ زمن است (۱) اگر برم نام بہشت

عمر نے سوچا کہ یاسمین یہ رباعی سن کر خوش ہوگی۔جو صرف اس کے لیے کہی گئی ہے۔وہ خوشی سے مسکرائے گی اور اس رباعی کو بعد میں پڑھنے کے لیے جب وہ اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے گی تو اس کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہوگی۔پھر

بھی عمر کو احساس تھا کہ یہ رباعی اچھی نہیں ہے۔ اس نے ان اشعار میں محبت کا تو کوئی حسین نغمہ لکھا نہیں ہے محض اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

لیکن یاسمین دوسرے روز بھی نہ آئی اور نہ اس سے اگلے دن۔

عمر گھنٹوں چنار کے درخت کے نیچے چشمے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ مسجد کے احاطے میں بیٹھ کر ہر اس برقع پوش عورت کو جو وہاں آتی یا باہر جاتی دیکھتا لیکن ان میں اسے یاسمین دکھائی نہ دی۔

سہ پہر کے وقت وہ تیز تیز قدموں سے اپنے منارے میں واپس آ جاتا اور اسے اپنے دل میں یقین ہوتا کہ وہ ضرور وہاں اس کا انتظار کر رہی ہو گی لیکن اسے سب کمرے خالی ملتے۔ پھر وہ سوچتا کہ یاسمین بیمار ہو گئی ہو گی اور غالباً اتنی بیمار ہو گی کہ کوئی پیغام بھی نہ بھیج سکے گی۔ اب عمر کو اس بات پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے توتوش کے فراہم کردہ ملازموں کی خدمات کیوں قبول نہ کیں کیونکہ اب اسکی نظر میں کوئی ایسی عورت نہ تھی جسے وہ کتب فروشوں کے مکان پر بھیجے اور یاسمین کی خیریت منگوائے اور اگر وہ کوئی خط دے تو لے آئے۔

مسجد کی طرف جاتے ہوئے عمر بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے وہی چیچک رو فقیر ملا جو کتب فروشوں کی گلی میں پھرا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ یہ فقیر اس کی نظر بچا کر جلدی سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

عمر نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا بتا تو نے کیا دیکھا ہے جو مجھ سے چشمے پر باتیں کیا کرتی تھی؟

فقیر نے اپنی سرخ پپوٹوں والی آنکھوں سے عمر کو بغور دیکھا اور جواب دیا میرے نوجوان آقا اپنے سر کی قسم میں نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ جا چکی ہے''۔

عمر نے لرزتے ہونٹوں سے پوچھا چلی گئی؟ اس نے فقیر نے چہروں کا مطالعہ کرنے میں مہارت تھی۔ دیکھا کہ نگرانی کے صلے میں اس نے جواب تک کمایا ہے اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ کمانے کا موقع ہے۔ اس نے عمر کی آستین پکڑ کر دھیرے سے کہا ''شی میں نے سنا ہے..... لیکن میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہے.....''

خود بخود عمر کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا لیکن اس نے دیکھا کہ جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ وہ بے چین ہو گیا اور فقیر کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اس نے سود خور کی دکان کی تلاش میں چل دیا۔ جس سے وہ طالب علمی کے زمانہ میں قرض لیا کرتا تھا۔ یہ سود خور بخارا کا رہنے والا تھا جو اپنی دکان پر سکوں کے انبار لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ جن میں یونانی سکے بغداد کے درہم اور تانبے کی ہر شکل کے پیسے ہوتے تھے اس انبار میں بعض سکے مربع شکل کے بعض سوراخ دار اور کچھ ہاروں کی شکل میں پروئے بھی ہوتے تھے۔

عمر نے سود خور سے کہا ''ناصر بیگ مجھے ایک مہینے کے لیے ایک دینار قرض دے دو''۔

سود خور نے ایک بھاری سی تھیلی ٹٹولتے ہوئے جواب دیا ''ہر ماہ چاندی کا ایک درہم سود لگے گا''۔

جلدی کرو عمر نے دینار لیتے ہوئے کہا اور دینار فقیر کو دے دیا۔ پھر اسے ہجوم سے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ''تجھے کیا معلوم ہوا ہے؟ سچ بولنا اور سچی بات ہی بتانا''۔

''اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا کرے میرا سر قلم ہو جائے۔ چار دن ہوئے انہوں نے تمہاری دلآرام کو گھر سے باہر گھومنے پھرنے کی پاداش میں مارا پیٹا۔ میں نے یہ بات چشمے پر دوسری معمر عورتوں کی زبانی سنی ہے۔ اب اس لڑکی کا چچا گھر کا مالک ہو گیا ہے ہاں شیشے کے مکان کے لیے ایک پتھر ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کا چچا بہت ناراض تھا۔ پھر دوسرے روز خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ابوزید کپڑے کے تاجر کی طرف سے اس لڑکی کا دوسرا پیام آیا۔ اور چچا نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا''۔

عمر نے کوئی جواب نہ دیا اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

فقیر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا بخدا انہوں نے ابوزید کو اپنے گھر بلوایا قاضی اور گواہوں کو طلب کیا او میں نے اپنی آنکھوں سے ان سب کو آتے دیکھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آئے اور انہوں نے پلاؤ زردہ کھایا۔ تھوڑا سا کھانا انہوں نے مجھے بھی دیا''۔

''اور وہ..... اس کا کیا ہوا؟''

فقیر نے جواب دیا ''میں نے ایک فراش کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ شادی سے پہلے رات بھر روتی رہی اور دو آدمی اسے پکڑ کر لائے تھے۔ شاید وہ بھاگ گئی ہو گی۔ شاید وہ خوف زدہ تھی۔ کم سن لڑکیاں ضدی اور جاہل ہوتی ہیں۔ لیکن ابوزید نے معقول مہر

دیا ہے کیونکہ اسنے یاسمین کے حسن کی شہرت سنی تھی۔ ابوزید تاجر ہے اور اس کے قافلے میں بہت سے خیمے ہیں.....''

فقیر عمر کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ عمر گھوم کر ایک طرف لوگوں کو اس طرح ہٹا ہٹا کر آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہو۔ چیچک زدہ فقیر نے دینار ہاتھ میں لے کر دیکھا اور پھر اسے پتھر کی طرح بجایا۔ دینا کھرا تھا۔ فقیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اسے اپنے چاندی کے سکوں کے ساتھ رکھ لیا جو اس نے آج سے تین روز قبل یاسمین کے چچا سے یہ اطلاع دینے کے سلسلے میں حاصل کیے تھے کہ یاسمین قبرستان کے قریب والے منارے میں کسی اجنبی نوجوان سے ملنے جایا کرتی ہے۔

اس وقت فقیر کے دل میں یہ خیال تھا کہ وہ عمر یا ابوزید کے مقابلے میں یاسمین کے چچا سے زیادہ رقم وصول کر سکتا ہے۔ فقیر سے یہ اطلاع پانے کے بعد یاسمین کا چچا اس پر کڑی نگرانی رکھنے لگا۔ اور اس نے جلد ہی کپڑے کے تاجر ابوزید کو بلوا بھیجا۔

لیکن اب عمر نے فقیر کو تعجب انگیز حد تک مالا مال کر دیا تھا اور سونے کا دینار دیا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا سود خود کی دکان پر گیا اور اس سے بولا ''ارے تو نے یہ کیا حماقت کی کہ اس لاوارث طالب علم کو جو سڑکوں پر آوارہ پھرا کرتا ہے قرض دے دیا''۔

بخارا کے اس سود خود نے جلدی سے اپنے سکوں کے ڈھیر کے گرد اپنے ہاتھوں سے حلقہ بنا لیا اور اپنی جیب سے چاقو نکالتے ہوئے بولا ''چوروں کے استاد ذرا بچ کر کھڑا ہو۔ تیرے چرانے کے لیے یہاں کوئی سکہ نہیں ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ نظام الملک نے اسی طالب علم کو اپنی عنایات سے نوازا ہے۔

''ارے خیام کو؟'' فقیر نے ایسے مغموم لہجے میں کہا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ کاشوہ پہلے سے یہ جانتا تو محض اس کا راز افشا کر دینے کی دھمکی ہی دے کر اس سے دگنی رقم وصول کر لیتا۔ کاش اسے یہ علم ہوتا!

اس دن عمر کو سوائے اپنے دل کے نالوں کے نہ کوئی بات سنائی دیتی تھی اور نہ کوئی چیز دکھائی دیتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ کتب فروشوں کی گلی اور چشمے پر گیا اور یاسمین کے چچا سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ ایک اجنبی شخص گھر میں سے نکلا اور آتے ہی اس پر بگڑنے لگا۔ عمر نے دیکھا کہ یاسمین کا بوڑھا باپ جو بہت دبلا اور زرد ہو چکا تھا دکان کے اندر کتابوں کے انبار میں چھپا بیٹھا ہے۔

یاسمین کے چچا نے اس سے کہا ''کیا تو پاگل ہے کہ کھلے بندوں مستورات کا ذکر کر رہا ہے؟ کیا اس گھر کی خواتین جانور ہیں جو تو اس طرح ان کا نام لے رہا ہے؟''

ایک عورت پردے کے پیچھے سے چیخی ''اس سے کہو ذرا ہوش میں آئے۔ اس چور کو جسے ذرا بھی شرم نہیں خدا کی قسم تعجب ہوتا ہے کبھی کسی چور کو یہ جرات ہوئی ہے کہ جہاں سے اس نے چوری کی ہو وہاں واپس آ جائے اور شور و واویلا مچائے؟ اس کی جوتوں سے خبر لو اور باندھ کو خوب مارو۔ ارے گیدی جہنمی باپ کی اولاد!''

لیکن گھر کے مرد اتنے پاگل نہ تھے کہ وہ خیام پر جنون و دیوانگی کے اس عالم میں ہاتھ ڈالتے۔ ادھر عورتیں بے تحاشا چیختی رہیں یہاں تک کہ عمر ان کی ڈانٹ پھٹکار سے عاجز آ کر وہاں سے بھاگا کئی گھنٹے کے بعد عمر نے ایک جوہری کی دکان پر توتوش کو دیکھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا ایک نیلم دیکھ رہا تھا۔ عمر نے بے ربط جملوں میں اسے

اپنا پورا قصہ سنایا اور جاسوسوں کا وہ سرغنہ غور س اس کی کہانی سنتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ جیسے اس کی توجہ نیلم کی طرف ہے۔

تو توش اس کا قصہ سن رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لڑکی کوئی طوائف یا کنیز ہوتی تو وہ اپنے اثر سے کام لے کر اس کا پتہ چلاتا اور اسے عمر کے حوالے کر دیتا۔

لیکن وہ ایک مسلمان کے حرم میں داخل ہو چکی تھی اور اپنے شوہر کی ملکیت تھی۔ تو توش جانتا تھا کہ نظام الملک مستورات کے معاملے میں مداخلت کرنا پسند نہ کرے گا..... کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق خواتین کو پردے میں رہنا چاہیے اور اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ عمر پر یاسمین کی محبت کا جنون سوار تھا۔ اور تو توش یہ نہیں چاہتا تھا کہ جس شخص کی وہ سرپرستی کر رہا ہے اس پر ایک عورت کا اتنا اثر غالب ہو۔ اگر بہت سی عورتوں کا اثر ہو تو بہتر ہو گا کیونکہ وہ خبر رسانی کرنے اور ترغیب دلانے کا بھی عمدہ ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک عورت کا اثر..... اور خاص طور سے وہ بھی یاسمین جیسی نوعمر لڑکی کا جسے وہ محبت سے سرشار سمجھتا تھا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تو توش نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا کہ وہ مداخلت نہیں کرے گا اور اس نے عمر کی باتوں پر محض رنج و ہمدردی کا اظہار کرنے پر اکتفا کی.....

تو توش نے مغموم لہجے میں کہا ''مجھے افسوس ہے کہ ایسا واقع ہوا۔ کاش تم میرے پاس پہلے چلے آتے۔ کیونکہ گواہوں کی موجودگی نکاح کے بعد عورت آہنی زنجیر میں جکڑی جاتی ہے۔ اس زنجیر کو کون توڑ سکتا ہے؟ اچھا ہم مل کر اس معاملے پر

غور کریں گے اور میں یہ بندوبست کروں گا کہ.....''

''لیکن آپ اس کا پتہ لگا سکتے ہیں؟'' یقیناً تم اس کا پتہ لگا سکتے ہو میں آئندہ ماہ اس سے نکاح کا پیام بھیج سکتا تھا..... اسے ڈر تھا'' کہ توتوش نے ایک سرد آہ بھر کر اور سر کے اشارے سے پھر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''یقین نہیں آتا لیکن قسمت کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے''۔

''تم پتہ لگاؤ کہ وہ کہاں ہے اگر مجھے معلوم ہو جائے تو!''

یقیناً فوراً پتہ لگا لوں گا اور آج رات ہی کو میں اپنے آدمی شہر کی مختلف سراؤں میں بھیجتا ہوں۔ کل صبح کو وہ تمہیں اس کا پتہ بتا دیں گے۔ اس وقت تک تم میرے پاس ٹھہرو۔۔

دوسرے روز صبح کو توتوش کے جاسوس یہ خبر لے کر آئے کہ مشہد کا کپڑے والا ابوزید نہ تو قافلے کے ساتھ ہے اور نہ وہ نیشاپور میں موجود ہے بلکہ اپنی نئی بیوی اور چند غلاموں کے ہمراہ وہ اس شہر سے چلا گیا ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ شمال، جنوب، مشرق مغرب میں سے کون سی سمت روانہ ہوا ہے۔ شہر سے بہت سی سڑکیں جاتی ہیں۔ اور ہزاروں تاجر ہیں لیکن یقیناً ابوزید جلد ہی واپس آ جائے گا۔ اور اس دوران میں وہ شہر کے ہر دروازے پر نگرانی رکھیں گے۔

توتوش کو توقع تھی کہ عمر اس خبر سے مطمئن ہو جائے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھا۔ خیام اپنی پرانی بھورے رنگ کی عبا پہن کر خود بازار گیا۔ وہ شہر کی ہر سرائے میں اونٹ والوں سے ابوزید کا پتہ پوچھتا پھرا اور پھر وہاں سے ایسا غائب ہوا کہ توتوش کے

جاسوس بھی اس کا پتہ نہ لگا سکے حالانکہ انہوں نے ابوزید کے مقابلہ میں اسے زیادہ تن دہی سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

عمر اونٹ والوں کے ہمراہ آوارہ پھرتا رہا۔ وہ راتیں بے چینی میں گزارتا اور صبح تڑکے ہی اٹھ بیٹھتا۔ جب اونٹوں کو بٹھا کر ان پر سامان لادا جاتا تو اونٹ بلبلاتے تو عمر خیام ہر سرائے میں تاجروں کو دیکھتا پھرتا۔ وہ ان میں سے ہر تاجر سے مشہد کے تاجر ابوزید کا پتا پوچھتا..... قافلے کی تیاری کے وقت جو چیخ و پکار مچتی اور اس وقت سرائے میں جو گرد و غبار اڑتا عمر اس عالم میں بھی تاجروں سے جلد جلد سوالات کرتا۔

عمر کے دماغ پر ایک جنون طاری تھا وہ مشہد کے ہر مسافر اور سرائے میں پہنچتا یہاں تک کہ امام رضا کے روضے پر بھی جہاں زائرین جمع ہوتے ہیں وہ ابوزید کو تلاش کرنے گیا۔

وہ عرصے تک سبز دار کے ستون کے پاس بوستان کی کاروان سرائے میں مقیم رہا۔ ایک مرتبہ وہ کسی ابوزید کے پیچھے شمال میں پہاڑوں تک گیا جہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ یہ شخص بخارا کا قالین فروش ہے"۔

عمر کو جو کرب اور بے چینی تھی وہ اسے سونے نہ دیتی تھی۔ ہاں جب سے وہ لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا تو اسے سکون محسوس ہوتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یاسمین تکلیف میں ہوگی اور غالباً بخار کے پسینے سے اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں بٹ گئی ہوں گی۔ یاسمین کو ایک کنیز کی طرح فروخت کر دیا گیا تھا اور ہو

کنیز ہی کی طرح نیشاپور سے باہر لے جائی گئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اسے مارا تھا۔ اسے برا بھلا کہا تھا اور اب وہ انہی سڑکوں میں سے کسی سڑک پر کہیں نہ کہیں رواں دواں قافلے میں موجود ہوگی۔

ہفتے گزر گئے موسم بہار میں جو پانی میدانوں میں نظر آتا تھا وہ دھوپ دے خشک ہو چلا تھا۔ آفتاب کی تمازت سے نرم مٹی لوہے کی طرح سخت ہوگئی تھی۔ اور چشمے کے کنارے کے سوا ہر جگہ ہریالی سوکھتی جارہی تھی۔

ذہنی کرب کے عالم میں عمر کو یہ خیال گزرا کہ اس چشمے کے کنارے سبزہ زار اور پھولوں کے ان پودوں پر نہ چلنا چاہیے جو سوکھنے سے بچ گئے ہیں۔ اس کے ذہن میں سوسن اور چنبیلی کے ان پھولوں کا یاسمین اور دریائے دجلہ کے ساحلی سبزہ زار سے گہرا تعلق تھا اور ایک درویش نے اسے دیکھ کر کہا "یقیناً اس شخص پر اللہ نے عذاب نازل کیا ہے"۔

مسلسل سفر اور گرمی بڑھ جانے سے عمر کو بخار آ گیا اور وہ دو ہفتے تک بیمار پڑا رہا۔ جب بخار اترا تو وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ سفر کرنے کے قابل نہ رہا تھا ایک نیک دل مشہدی مسافر نے اسے اپنے گدھے پر بٹھا کر وطن پہنچانے کی پیش کش کی۔

بخار اترنے کے بعد عمر کے حواس درست ہو گئے تھے اور وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس طرح اس کا جگہ جگہ مارے مارے پھرنا بے سود ہے وہ محسوس کر رہا تھا کہ یوں آوارہ پھر کر وہ اس درد سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسکے سینے میں جاگزیں ہو چکا ہے

اور اب تک یقیناً یاسمین کی جانب سے یا تو کوئی پیام منارے پر پہنچ چکا ہوگا یا تو توش کے جاسوسوں نے اس کا کچھ پتہ لگا لیا ہوگا۔ وہاں سے اس طرح چلے آنا بے وقوفی تھی لیکن سر دست وہ اتنا بیمار تھا کہ پیدل چل نہیں سکتا تھا۔

ایک روز سہ پہر کو جب قافلہ قبرستان والی سڑک پر پہنچ گیا تو عمر گدھے سے اتر کر اس کے مشہدی مالک سے رخصت ہوا۔ وہ اپنے منارے جانے والی پہاڑی پر چڑھا۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ منارے میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ چار دیواری کے اندر نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ اور غلام اس باغیچے کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں جو حال ہی میں لگایا گیا تھا۔ منارے کی فصیل کے اوپر پیتل کے آلات دھوپ میں چمک رہے تھے۔

رصد گاہ کے قریب پہاڑی پر ایک لکڑی کا مینار بنا دیا گیا تھا۔ عمر اس لکڑی کو جس کی بنیاد کے قریب مٹی کے اوپر دائرہ کھینچا گیا تھا دیکھنے کے لیے رکا۔ اتنے میں ایک باریش غال آیا اور اس کے قریب ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور بولا ''حضور آپ کا آنا مبارک ہو۔ ہم نے اس جگہ کو ٹھیک کرنے میں سخت محنت کی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھ کر خوش ہوئے؟''

لیکن غلام کو اس دبلے پتلے اور گرد آلود جوان کو دیکھ کر جو پھٹی ہوئی عبا پہنے تھا انتہائی تعجب ہو رہا تھا۔

عمر نے جواب دیا ''ہاں'' پھر وہ اپنے کمرے میں گیا۔ جہاں ہر چیز جوں کی توں پڑی تھی۔ پردے پر اژدھے کی تصویر اب بھی موجود تھی۔ بچھونے کے اوپر تکیے صفائی

سے لگے ہوئے تھے۔ اس نے غلام سے پوچھا ''بتاؤ کسی نے میرے لیے کوئی پیغام یا نشانی تو نہیں بھیجی؟''

غلام نے مسکرا کر سر ہلایا ''حضور! روزانہ آقائے توتوش کی جانب سے پیام آتا تھا اور وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ آپ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔ ابھی میں نے لڑکے کو یہ پیام دے کر نیشاپور بھیجا ہے وہ آپ تشریف لے آئے ہیں''۔

''اس کے علاوہ اور کوئی قاصد تو میرے پاس نہیں آیا؟ کوئی خط بھی نہیں؟'' عمر نے غلام سے پوچھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یاسمین لکھنا تو نہیں جانتی لیکن پھر بھی ممکن ہے اس نے بازار میں کسی خط لکھنے والے منشی سے کچھ لکھوا کر بھیجا ہو۔

غلام نے جواب دیا ''جی نہیں! نہ کوئی پیام نہ کوئی خط'' عمر دیوان خانے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور غلام چاندی کے جگ میں پانی لا کر اس کے پاؤں دھونے لگا۔ اتنے میں ایک سفید ریش شخص پر تپاک انداز میں سلام کر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے عمر سے کہا کہ میرا نام میمون ابن نجیب الواسطی ہے اور میں نظامیہ بغداد کا فارغ التحصیل ریاضی داں ہوں۔ نظامیہ بغداد وہ تحقیقی ادارہ تھا جسے نظام الملک نے اپنے اہتمام سے قائم کیا تھا۔ میمون بڑی متعجب نظروں سے عمر کو دیکھتا رہا جو خاموش بیٹھا تھا۔ میمون نے خشک لہجے میں اسے اپنی آمد کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ساتھ افلاطون کا ستاروں کا ترمیم شدہ نقشہ اور نظام الملک کے حکم سے پیتل کا وہ گلوب لایا ہوں جو خود بوعلی سینا استعمال کرتا تھا''۔

''اچھا'' عمر نے بے توجہی سے پوچھا۔ تپتے میدانوں اور دھوپ اور تپش کے

بعد اسے یہاں پہنچ کر اس خشک آواز کے علاوہ سکون اور خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

خواجہ میمون بڑبڑایا پھر اس تیزی لیس جیسے کوئی سارس کسی بے خبر کچھوے پر جھپٹتا ہے وہاں سے واپس ہو گیا۔ جب خاصی رات ہو گئی تو عمر مینار کی چوٹی پر گیا۔ اس وقت بوڑھے ریاضی داں سے بھی رہا نہ گیا اور وہ بھی اس جگہ جہاں اس کا خزانہ جمع تھا پہنچ گیا۔ اس انداز سے جیسے اسے خاموش عمر کی کوئی پرواہ نہ تھی میمون نے گلوب کے پائدان پر لگے ہوئے چار چراغوں کو روشن کیا اور پھر گلوب پر چھتریاں اس طرح لگائیں کہ چراغوں کی صاف اور خوشگوار روشنی اس بڑے گلوب کے نصب بالائی حصے پر پڑنے لگی۔ عمر چلتے چلتے رک گیا اور اس کی نتاہیں چمکتے ہوئے پیتل پر ٹھہر گئیں اور وہ اس کے قریب آ کر اسے دیکھنے لگا۔ ستاروں کے نشان کے گرد چھوٹے چھوٹے راستوں کی بے شمار لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ لکیریں بہت مہین تھیں اور صرف کہیں کہیں جہاں ستاروں کا گچھا بنا ہوا تھا ایک آدھ لفظ ان باریک لکیروں پر کندہ تھا۔ اس گلوب پر بہت سے لوگوں نے محنت کی ہو گی کیوں کہ جہاں جہاں اس پر نئی لکیریں پرانے خطوط کاٹتی تھیں وہ حصے صاف طور پر نمایاں تھے۔ عمر نے اس جگہ کو دیکھا جہاں دم دار ستارے کا آخری حصہ قطب ستارے سے علیحدہ ہوتا تھا..... اس نے افق کا دائیں سے بائیں کو جائزہ لے کر گلوب پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اسے گھمایا یہاں تک کہ اس کی حیثیت وہ ہو گئی جو اس جگہ جہاں وہ کھڑا تھا۔ آسمان پر ستاروں کی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے افق کے حلقے کو ٹٹولنے لگا۔

''یہ اس طرح لگایا جاتا ہے اور اسے اس طریقے سے بند کیا جاتا ہے'' اسحاق

نے اپنی خشک آواز میں کہا۔

عمر نے جواب دیا ''ہاں ہاں' بالآخر اس کے پاس وہ گراں قدر خزانہ

دوسرے دن جب توتوش اس سے ملنے آیا تو وہ اسے دیکھ کر بولا ''ارے خدا کی قسم! تو تو ایسے سنیاسی معلوم ہو رہے ہو جو جنگل اور بیابانوں سے نکل کر آیا ہو۔ ہم نے تمہیں کہاں کہاں تلاش کیا مگر تم نظام الملک کو کیا جواب دو گے اور اس کے غصے کو کس طرح ٹھنڈا کرو گے خیر کوئی بات نہیں..... اب جبکہ تم یہاں پہنچ گئے ہو تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

عمر نے پوچھا ''میری غیر موجودگی میں یاسمین کی طرف سے کوئی پیام یا کوئی نشانی تو نہیں پہنچی؟''

جاسوسوں کے سرغنے نے ہمدردی سے آنکھیں جھپکا کر جواب دیا ''اچھا اس لڑکی کی طرف سے؟ نہیں میرے خیال میں کوئی نہیں۔ میں نے تو کچھ سنا ہی نہیں''۔

''لیکن تمہارے آدمیوں کو تو اس کی خبر ملی ہوگی؟''

توتوش نے اپنے ہونٹ کھینچ لیے اور اظہار افسوس کرتے ہوئے سر جھکا کر انکار کیا۔ وہ بولا ''میرے آدمیوں نے باز کی طرح جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا۔ بازار میں اور لڑکیاں ملتی ہیں نوخیز ایرانی بلبلیں اور سمرقند کے رستے آنے والی چینی کنیزیں جو بہت ہی سلیقہ مند اور نہایت ہوشیار ہوتی ہیں۔ لیکن نظام الملک ناراض ہے' ہمیں اسے دکھانے کے لیے کچھ کام کرنا چاہیے..... اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ منصوبہ ہونا چاہیے.....''۔

عمر خاموش تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں منصوبے کا خیال تک نہ تھا۔

''نوجوان ذرا سوچو اس منصوبے کو یاد کرو جو تم ایوان دانش سے لے کر چلے تھے اور اگر تمہیں سرپرست مل جاتا تو اس وقت تمہارے ذہن میں کیا کام کرنے کا خیال تھا؟''

میں ایک نئی جنتری بنانا چاہتا ہوں۔

کیا؟

وقت ناپنے کا صحیح پیمانہ جس میں گھنٹے ضائع نہ ہوں۔

تو توش نے عمر کو تشویش ناک نظر سے دیکھا۔ غلاموں نے اسے اطلاع دی تھی کہ ہمارے نئے آقا کی حرکات وسکنات بہت عجیب ہیں اور اس نے مسکرا کر عمر سے کہا ''ہماری حالت پر رحم کرو۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے چاند بنایا ہے جب وہ پہلی بار نمودار ہوتا ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اب نیا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ یقیناً کوئی فانی بندہ ایسا آلہ نہیں بنا سکتا جو ہمیں چاند سے زیادہ صحیح وقت بتا سکے۔ ہاں تو پھر'' عمر نے غصے سے بے چین ہو کر کہا ''مصریوں نے بھی ایسا آلہ بنایا ہے۔ عیسائیوں نے بھی بنایا ہے لیکن تم نے جو یہاں یہ لکڑی کا چھوٹا سا تختہ لگایا ہے ی تو بچوں کے کھیلنے کے کام آ سکتا ہے۔ ذرا آ کر دیکھو تو'' پیچھے پیچھے خواجہ میمون اور آگے وہ دونوں لکڑی کے ڈنڈے کو دیکھنے گئے۔ تو توش نے شاہی نجاروں کی مدد سے اس ڈنڈے کو اپنی نگرانی اور محنت سے وہاں لگوایا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ڈنڈا نیچے لگی ہوئی چکنی مٹی پر بہت صاف اور حسین سایہ ڈالتا تھا۔ لیکن عمر نے اسے اپنے کندھے کے ایک جھٹکے

سے اکھاڑ کر پہاڑی کے نیچے پھینک دیا۔عمر کیدل میں جوریگستان کی سڑکیں طے کر کے آیا تھا اس وقت غصے سے آگ لگی ہوئی تھی وہ چیخ کر بولا ''یہ ڈنڈا تو ہوا کے جھونکوں سے چلتا ہے اور دھوپ سے خراب ہو جاتا ہے۔کیا ہم بچوں کی طرح گھروندے بنا رہے ہیں ہمیں تو وہ چیز چاہیے جو کافروں کے پاس تھی۔آدمی کے قد سے پانچ گنا اونچا سنگ مرمر کا مینار جس کا ہر پہلو اور جس کی چوٹی ناخن کے برابر باریک ہو پھر اس کی بنیادیں سنگ مرمر کا پختہ فرش ہو۔جس پر اس کے سائے سے مثلث کی شکل بنے۔فرش کے پتھر چکنے اور صاف ہوں اور تانبے کے ٹانکوں سے جڑے ہوں۔اوران کی سطح پانی کی طرح ہموار ہو۔اچھا تم کاریگروں کو میرے پاس بھیج دو۔میں انہیں بتا دوں گا کہ کیا کام کرنا ہے''۔

توتوش نے آہستہ سے جواب دیا ''پہلے مجھے نظام الملک کی منظوری لینا چاہیے۔ایسا مینار بنانا تو میرے خیال میں کافروں کا مندر بنانا ہوا.....''

'سورج کے سایے میں روزانہ بال برابر فرق ہوتا ہے اس کو ناپنے کا واحد طریقہ یہی ہے''۔

''بال برابر''توتوش نے اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے کہا اور خواجہ میمون کو ایک رف لے جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کہنے لگا ''تمہارا کیا خیال ہے کہیں عمر کا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا؟''

بوڑھے میمون نے جواب دیا ''وہ اپنے ہوش وحواس میں ہو یا نہ ہو اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ حساب لگانے کے معاملے میں احمق نہیں

ہے''۔خواجہ میمون نے یہ الفاظ اس طرح مسکرا کر کہے کہ اس کی داڑھی کے بال ہلنے لگے۔پھر وہ بولا۔''جس قسم کا ستون عمر چاہتا ہے وہ یقیناً صحیح ہوگا۔اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر وہ صحت کے ساتھ بنایا گیا تو اتنا ہی درست اور صحیح ہوگا جتنا وہ سامنے رکھا ہوا بوعلی سینا کا عظیم گلوب ہے.....''

تو توش نے یہ قصہ جو اس کی سمجھ سے باہر تھا نظام الملک کو سنایا عمر کے غائب ہو جانے سے خود نظام الملک کے منصوبوں میں خلل پڑ گیا تھا وہ تو توش کے بیان کو بے توجہی سے سنتا رہا پھر تو توش نے اسے بتایا کہ وقت کو ناپنے کے متعلق عمر کی تجویز خواجہ میمون نے بھی منظور کیا ہے۔

وزیر اعظم نظام الملک نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا''وقت کا گوشوارہ بنانا تو ہماری روایات کے منافی ہے.....اور علماء اس کی مخالفت کریں گے۔عیسائیوں کے پاس رومی عہد سے ایک جنتری آ رہی ہے ساسانیوں کا بھی سال مقرر ہے اور ہم ایرانیوں کے پاس بھی فتح اسلام سے قبل یزدگردی سنہ موجود تھا۔میرا خیال.....میرا خیال ہے کہ گوشوارے کا بنانا خطرناک کام ہوگا''۔

تو توش نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔''پہلے تو عمر مجھ سے یہ کہتا ہے کہ وقت صرف ایک ہوتا ہے اور اب نظام الملک یہ کہہ رہے ہیں کہ وقت چار مختلف قسم کا ہے خدا میری عقل پر رحم کرے۔

نظام الملک نے اس کی بات کاٹ کر کہا''چار جنتریاں ہیں اور ملک شاہ اب بھی عمر کو طلب کر رہا ہے''۔

''اور عمر کو دن میں ایک ایک منٹ کا وقت ناپنے کے لیے پانی کے گھڑیال کی ضرورت ہے معلوم نہیں وہ اس کا بنائے گا کیا..... کیا وہ سوتے جاگتے ہر لمحے اسے تکا کرے گا۔

اس کی مدد سے وہ بہار اور خزاں کے موسم میں اس دن کا تعین کرے گا جب شب و روز کے درمیان ایک لمحے کا بھی فرق نہیں رہتا۔ بڑے ستون کے ذریعے وہ اس لمحے کا اندازہ بھی کر سکے گا جب دوپہر کے وقت سورج کا عکس سردیوں میں سب سے لمبا اور گرمیوں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اور ستاروں کی گردش کا مشاہدہ کر کے وہ ان دونوں کے حسابات میں ترمیم کر سکے گا۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ عمر کیا کرے گا''۔

تو توش نے منہ ہی منہ میں کہا انشاء اللہ۔

خدا نے چاہا تو ہم ملک شاہ کی تخت نشینی کی یاد میں نئی جنتری پیش کر دیں گے''۔

نظام الملک کو فوراً احساس ہوا کہ یہ منصوبہ بہت عمدہ رہے گا۔ سلطان اس بات میں خوش ہو گا کہ صرف اس ک لیے ایک نئی جنتری بنائی گئی ہے۔ اور عمر اور وہ دو باتوں پر خوش ہر کر ممکن ہے میری امید کے مطابق خیمہ دوز کے اس لڑکے کو شاہی منجم کا خطاب دے دے۔

وہ بولا ''میں اس کے لیے پانی کے نئے گھڑیال کا انتظام کروں گا۔ لیکن وہ کس وجہ سے یوں آوارہ پھرتا رہا''؟

تو توش آنکھ مار کر مسکرایا اور کہنے لگا ''خدا ہی بہتر جانتا ہے آپ کے غلام کو تو اس

کا کچھ علم نہیں ہے"

"تمہارا فرض ہے کہ اب تم اسے آوارہ نہ پھرنے دو کیونکہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

نظام الملک سے رخصت ہونے کے بعد توتوش جلدی جلدی اپنے گھر پہنچا۔ اکثر وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایک پرانے کارخانے کے گوشے میں جہاں سے بازار اور مسجد کا صحن نظر آتا تھا چھپ جایا کرتا تھا۔ اس جگہ وہ اپنی ایسی چیزیں رکھتا تھا جو کسی کو دکھانی نہیں چاہتا تھا۔ اس خفیہ جگہ پر ایک گونگے مژری غلام پہرا رہتا تھا۔ جو اپنے آپ کو ان کمروں کا مالک بتاتا تھا۔ یہاں ایک صندوق کے اندر جس میں تین تین تالے پڑے ہوئے تھے توتوش نے چاندی کا ایک نازک بازو بند نکالا جس میں آسمانی رنگ کے حسین موتی جڑے ہوئے تھے۔

یہ بازو مرحوم سلطان کا محبوب اور کوزہ پشت مسخرا منارے میں لایا تھا۔ کوزہ پشت مسخرے نے کہا تھا کہ یہ تحفہ یاسمین نام کی ایک عورت نے بھیجا ہے اور یہ کہلایا ہے کہ میرا دل درد سے بے چین ہے اور مجھے حیفہ جانے والی سڑک پر لے جایا جا رہا ہے۔

توتوش نے اپنے دل میں کہا "عمر صرف اس معاملے میں سخت ہے اور کچھ بھی ہو میں اسے مغربی علاقے میں حفیہ تک نہ جانے دوں گا۔ کیونکہ مجھے نظام الملک کے غضب کا نشانہ بننا پڑے گا"۔ توتوش نے فیصلہ کیا کہ میں چاندی کے اس تحفے سے نجات حاصل کرلوں اور اس تحفے کو اپنی جیب میں رکھ کر توتوش نے صندوق بند کیا اور وہ باہر نکل آیا۔ اور ایک چشمے پر پہنچا جہاں کمسن بچوں کی ایک ٹولی کھیل رہی

تھی۔ تو توش نے جیب سے چاندی کا بازو بند نکال کر اس چشمے میں پھینک دیا۔ جب چاندی کا یہ بازو بند چشمے کی تہہ میں پتھروں سے جا ٹکرایا تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا تک نہیں۔ پہلے وہاں خاموشی تھی اور پھر اسے ہلکی ہلکی چیخ و پکار اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے جلد جلد چلنے کی آوازیں سنائی دیں تو توش نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چشمے پر کوئی نہ تھا اور چاندی کا بازو بند غائب ہو چکا تھا۔

تو توش مسکرایا اور بولا "پتھر کو پتھروں اور ریت کے ذرے کو ریگستان میں چھپانا چاہیے"

نظام الملک کی رصد گاہ کے معاملات سے مطمئن تھا۔ موسم گرما خت ہونے سے قبل رصد گاہ میں پانی کا گھڑیال نصب ہو چکا تھا۔ اس گھڑیال میں ایک چھوٹا سا پہیا تھا جو ایک گھنٹے میں ساٹھ بار گھومتا تھا اور ایک بڑا پہیا تھا جو ایک گھنٹے میں صرف بارہ چکر لگاتا تھا۔ ایک نشان لگے ہوئے پیمانے پر نیزے کی سی نوک رکھنے والی چاندی کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ جو ایک دوپہر سے دوسری پہر تک پورے پیمانے پر پھر جاتی تھی اور دوسرے روز پھر واپس چلنے لگتی تھی۔ کم از کم تو توش کے نزدیک یہ گھڑی تعجب انگیز حد تک صحیح تھی۔ لیکن خواجہ میمون نے اسے بتایا کہ تقریباً ایک سال کے عرصے میں وہ اندازہ لگا سکیں گے کہ صحیح وقت اور اس گھڑی کے درمیان کتنا فرق ہے۔ تو توش نے جواب دیا کہ اس گھڑیال میں اس چھوٹے سے سوار کی کمی ہے جو نیزے کے دنوں کا نشان لگائے جیسا کہ محل میں ہوتا ہے۔ اس پر میمون نے تو توش پر بس ایک ترخم خیز نگاہ ڈالی۔ وہ خاموش رہا گویا اس کا مطلب ہوا کہ ریاضی کے ماہروں کو

دنوں کی یاد دلانے کے لیے فرضی قصوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بالآخر تمام آلات اپنی اپنی جگہ لگا دیے گئے اور مشاہدہ کرنے کے لیے چار اور اشخاص منتخب کیے گئے سنگ مرمر کا نیا ستون تعمیر ہو چکا تھا۔ اور اب میمون بھی یہ کہتا تھا کہ ہم وقت کا نئے سرے سے تعین کرنے کا زبردست پروگرام شروع کرنیوالے ہیں۔ میمون کی رائے تھی کہ یہ کام سات سال میں پورا ہوگا۔ لیکن عمر کے خیال میں وہ چار یا پانچ سال میں ختم ہوسکتا ہے۔

تو توش نے تعجب سے کہا ''بخدا ہم تو چار یا پانچ ہفتوں میں ایک محل تعمیر کر سکتے ہیں''

یہ سن کر عمر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ بولا ''جی ہاں! اور جب آپ کا محل ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن جائے گا اور اس میں چھپکلیاں رہنے لگیں گی تب بھی ہمارا گوشوارہ ایسے ہی قائم رہے گا''۔

جاسوسوں کا سرغنہ موٹا تو توش ہنسا اور کہنے لگا۔

''اگر میرے پاس محل ہوتا تو مجھیاس کی ذرا بھی پروانہ ہوتی کہ مرنے کے بعد مجھے چھپکلیوں کے درمیان ڈال دیا جائے تو کیا ہوگا۔

بہر حال اسنے نظام الملک کو مطلع کر دیا کہ رصد گاہ میں چھ منجم تعینات کیے گئے ہیں اور وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہیں۔ یہ اطلاع پانے کے بعد نظام الملک نے منصوبہ بنایا کہ موسم خزاں میں اعتدال شب و روز سے پہلے کے ہفتے میں جس میں عمر نے اپنا مشاہدہ شروع کرنے کے لیے کہا تھا سلطان ملک

شاہ کے لیے رصدگاہ میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا جائے۔

نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو یہ ترغیب دی کہ جس روز وہ ہرن کا شکار کو جائے واپسی پر منارے کا معائنہ کرے۔ اس دن دوپہر تک رصدگاہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ باغیچے میں قالین بچھا دیے گئے اور درختوں کے نیچے مٹھائی کے تھال اور شربت کے گلاس رکھ دیے گئے''۔

پھر رصدگاہ میں مدرسے کے معلمین کا ایک وفد پہنچا۔ ان کے ساتھ الجبرے کا ماہر استاد علی بھی آیا۔ تمام معلمین درباری خلعتوں میں ملبوس تھے۔ اس کے علاوہ مسجد کے ملاؤں کی ایک جماعت بھی آئی اور جو دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے نظام الملک نے ان ملاؤں ابڑا شاندار خیر مقدم کیا اور انہیں اس تکت کے بالکل قریب بٹھایا جو ملک شاہ کے لیے بچھایا گیا تھا۔ اور جس پر ریشم کا تخت پوش بچھا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ملا اس مذہبی مجلس کے رکن ہیں جسے زبردست اقتدار حاصل ہے۔ اور جسے سائنس کی ایجادوں سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے عمر کو ہدایت کی کہ تمام احتیاط سے ان کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور ان کے سامنے کچھ نہ بولنا۔

عمر کو کچھ بولنے کی خواہش بھی نہ تھی۔ وہ تو ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کسی دعوت میں اسے بطور مہمان بلایا گیا ہو اور اس وقت جب رسمی آداب و کورنش کا سلسلہ ختم ہوا اور سب لوگوں کی نگاہیں سواروں کے اس دستے کو دیکھنے لگیں جو دریا کی ڈھلان سے اوپر آ رہا تھا تو عمر کو خوشی ہوئی۔

چشم براہ غلاموں کے قالین بچھانے سے پہلے ہی ملک شاہ نے اپنا شکار کا نیزہ ایک غلام کے ہاتھ میں رکھ دیا اور رصد گاہ کے دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ وہ گرد میں اٹا ہوا تھا اور بھرپور سواری کرنے کی وجہ سے خوش تھا لیکن عمر نے محسوس کیا کہ نوجوان سلطان کو نظام الملک اور بوڑھے ملاؤں سے مل کر حقیقی مسرت نہیں ہوئی۔ ملک شاہ کی گردن میں ہار پڑے تھے۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ جانوروں کے سے بچے تلے انداز سے چلتا تھا۔ بات کرتے وقت نہ وہ اپنے ہاتھ اٹھاتا تھا اور نہ اونچی آواز میں بات کرتا تھا۔

جب عمر نے نظام الملک کے ساتھ جا کر سلطان کو مودبانہ کورنش پیش کی تو اس نے نوجوان نجومی کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا ''اچھا یہی ہے وہ شخص؟''

عمر نے حسب توقع جواب دیا ''جی ہاں میں ہی ہوں دنیا کے آقا سلطان ملک شاہ کا غلام''۔

''خراسان کی سڑک پر تو ہمارے پاس حاضر ہوا تھا۔ اور تو نے ہم سے آئندہ کے متعلق پیشن گوئی کی تھی۔ حالانکہ ہمارے مصاحبین نے جھوٹی باتوں کا طومار باندھ رکھا تھا۔ ہم تیری پیشن گوئی کو نہیں بھولے بتا اب تو ہم سے کیا لینا چاہتا ہے؟''

ایک لمحے تک سلطان اور عمر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایک طرف وہ جنگجو سلطان تھا جس کے خیالات اسلامی دنیا کی گہما گہمی سے ابھی تک الگ تھے اور جو ابھی تک اپنے اسی مورث اعلیٰ خاقان کا فرزند تھا۔ جس نے دنیا کے بلند ترین علاقے کے اس پار مویشیوں اور نسانوں پر سلطنت کی تھی..... اور دوسری طرف وہ

طالب علم تھا جو ابھی تک تصورات کی دنیا میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ **ملک** شاہ کی عمر بیس سال تھی اور عمر کا سن بائیس سال!

''میں چاہتا ہوں مجھے شاہی ملازمت میں لے لیا جائے'' **ملک** شاہ نے مسکرا کر کہا ''منظور ہے اچھا اب ہمیں دکھلا کہ تو نے یہاں کیا بنایا ہے؟''

سلطان سنگ مرمر کے اونچے ستون کو دیکھ کر خوش ہوا۔ اور اس نے دوسرے آلات کو بھی شوق سے دیکھا۔ جب بوڑھے میمون نے جو مہمانوں کے ہجوم میں اور بادشاہ کے حضور میں عجب بے تکا معلوم ہو رہا تھا سلطان کو آسمان کے عظیم گلوب کے متعلق بتانا شروع کیا تو **ملک** شاہ نے عمر کی طرف دیکھا اور اسے گلوب کی تشریح کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان نجومی کے واضح الفاظ میں اس کی صراحت چاہتا تھا۔

ملاؤں کا صدر یہ نہ دیکھ سکا کہ سلطان سائنس کے آلات سے اتنی دلچسپی لے وہ اپنی اہمیت جتانے کے لیے آگے بڑھا اور بولا ''غور سے سنو قرآن شریف میں یہ لکھا ہے کہ تم اگر عبادت کرنا چاہتے ہو تو سورج یا چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کے آگے جھکو جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے۔

قرآن شریف کی اس آیت کو سن کو سب ملاؤں نے ''حق ہے حق ہے'' کہا لیکن عمر نے فوراً ہی جواب دیا ''کلام اللہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ دن اور رات کی نشانیاں ہیں اور چاند اور سورج بھی۔ تاوقتیکہ ان نشانیوں کی تشریح نہ کی جائے ہم انہیں کیسے سمجھیں گے۔''

ملک شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے آباؤ اجداد جو بت پرست اور ترک اور

وحشی تھے اسلام قبول کر چکے تھے اور ملک شاہ مذہب کا اتنا ہی سختی سے پابند تھا جتنا کہ نظام الملک۔ اس نے پرتپاک انداز میں ملاؤں کے صدر سے اجازت چاہی اور جب اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا تو عمر کو اپنے قریب بلا کر کہا "وزیر دولت نے ہم سے درخواست کی ہے کہ تجھے شاہی منجم کا عہدہ دے دیا جائے۔ ہم نے اسے منظور کر لیا کل دربار میں تجھے ایک اعزازی خلعت عطا کیا جائے گا" بے ساختہ سلطان اس کی طرف جھکا اور پھر بولا "کبھی کبھی ہمارے پاس بھی آ کر بیٹھا کر۔ اپنے سر کی قسم ہمیں اکثر شگون معلوم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے"۔

پھر سلطان نے گھوڑے کی باگ موڑ دی اور اچانک گھوڑے کی تیز ٹاپوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ چند لمحوں میں سلطان پہاڑ کی ڈھلان پر جا رہا تھا اور اس کے پیچھے گروہ در گروہ شاہی امیروں اور شکاریوں کی ایک لمبی قطار تھی۔

اس کے بعد نظام الملک عمر سے تنہائی میں ملا تو اسنے کہا "تو نے برا کیا۔ صدر العلماء کی بات کاٹی۔ ممکن ہے اب وہ تیری راہ میں روڑے اٹکائیں"۔

لیکن کیوں میرے سرپرست مجھے علماء سے کیا سروکار ہے؟

"دیکھ عمر آئندہ ان کو نہ چھیڑیو! بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی بہت سی باتیں جو تو نہیں جانتا اور جو تجھے سیکھنی ہیں۔ پہلے تو دربار میں تیرا تقرر عمل میں آئے گا اور تجھے بغیر کوئی محصول ادا کیے بارہ سو مثقال سالانہ تنخواہ ملے گی"۔

افوہ عمر نے تعجب سے کہا۔ اس نے تو خواب میں بھی اتنی بڑی رقم کا تصور نہ کیا تھا۔

نظام الملک نے بے توجہی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اور ممکن ہے کہ ملک شاہ تجھے اور تحائف بھی دے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ تجھ پر مستقل عنایت کرے گا لیکن یہ نہ بھولنا کہ جس شخص سے وہ بدظن ہو جاتا ہے اس کے ساتھ فولاد کی سی سختی سے پیش آتا ہے۔ محل کے اندر اس کے جاسوس ایسے چھپے ہوئے ہیں کہ جیسے شہد کی مکھیاں اپنی مہال میں چھپی رہتی ہیں۔ تیرے عروج کی بنیاد اسی کی عنایت پر قائم ہے۔ وہ نہ رہی تو تو بھی کہیں کا نہیں رہے گا''۔

عمر کو تعجب ہو رہا تھا کہ اپنے کام میں انہماک کے ساتھ ساتھ اسے نوجوان کی جسے وہ دل سے پسند کرتا تھا عنایت حاصل کرنے کی بھی کوشش کرنی ہو گی۔ نظام الملک نے اس کے ان خیالات کا اندازہ لگا لیا اور سنجیدگی سے کہا۔

''تجھے میری سرپرستی حاصل ہے اور سر دست خدا کے فضل سے کسی میں میری علانیہ مخالفت کرنے کی ہمت نہیں لیکن مجھے بھی اپنا کام کرنا پڑتا ہے.....''

نظام الملک نے آہستہ سے عمر کو بتایا کہ وہ سلطان کے لیے نئی سلطنت کا نقشہ تیار کر رہا ہے۔ تین نسلیں پہلے جب سلجوق ترک نہیں آئے عالم اسلام میں اختلافات جنگ و جدال اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خود بغداد میں موجودہ خلیفہ کو اس اقتدار کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوا جو کسی زمانے میں ہارون الرشید کو حاصل تھا۔ یہاں تک کہ سلجوق ترک قبائل کو لے کر خلیفہ کی امداد کو آئے۔ شیر دل سلطان الپ ارسلان مشرق سے آندھی کی طرح اٹھا اور مغرب کی جانب خراسان میں دشمنوں کا صفایا کرتا ہوا فاتح و کامران اور خلیفہ کی جانب سے تسلیم شدہ سلطان کی حیثیت سے بغداد میں

داخل ہوا۔

اس وقت حیفہ فتح ہوا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو بھی نئی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ اوری تو عمر نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ ملازگرد میں بازنطینی عیسائیوں کو زچ کر کے سلطان نے ان پر فتح حاصل کی تھی اب سلطان کی وسیع سلطنت سمرقند سے قسطنطنیہ کی شہر پناہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور قیصر روم ملک شاہ کو خراج ادا کرتا تھا۔ نظام الملک نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آگے چل کر ملک شاہ کی ایک لڑکی کا موجودہ خلفیہ سے عقد کردے اور ملک شاہ کی شادی وہ قسطنطنیہ کے بازنطینی بادشاہ کی لڑکی سے کرا ہی چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوجوان سلطان کا اسلامی دنیا کے قانونی سربراہ اور قیصر روم دونوں میں خونی تعلق قائم کردے۔

نظام الملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اس موسم گرما میں سلطان اپنی فوج لے کر حیفہ جائے گا جہاں سے وہ بیت المقدس پر فوج کشی کرے گا۔ اور دنیا کے اس تیسرے مقدس ترین شہر کو عزیز مصر سے..... جو ایک فسادی اور کم ظرف انسان ہے۔ چھین لے گا"۔

عمر کو تعجب ہو رہا تھا کہ یہ آدمی کس اعتماد سے منصوبہ بنا رہا ہے۔ کہ فلاں شہر کو فتح اور فلاں علاقے کو سلطنت میں شامل ہونا ہے۔ نظام الملک اسے روزانہ اپنے پاس بلاتا اور ان جاسوسوں کے انتظام کے حالات بتایا کرتا جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور جو سلطان کی آنکھوں اور کانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے بڑی وضاحت سے عمر کو شاہ سلطان کے مزاج اور افتاد طبع کا حال بتایا اور اسے مطلع کیا کہ

سلطان شکار کا بہت شوقین ہے وہ عورتوں کے ساتھ بے حس کنیزوں کا سا سلوک کرتا ہے۔ اور شگونوں پر بہت اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں بتا کر نظام الملک نے آخر میں اس سے کہا "ہمیشہ یاد رکھنا کہ اس کا دادا وحشی تھا۔ اگر ملک شاہ کو یہ وہم ہو جائے کہ اس کا نجومی دشمنوں سے تنخواہ پاتا ہے تو اس نجومی کو تباہ کرنے کے لیے اس کا وہم ہی کافی ہو سکتا ہے"۔

عمر نے سر ہلایا وہ خوب سمجھتا تھا کہ بد دماغ آدمی کسی شخص کو بھی تباہ کر سکتا ہے۔

پھر نظام الملک نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "گویا تیرا کام بہت اہم ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے زائچوں اور شگونوں پر اعتقاد نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا صرف یہ عقیدہ ہے کہ ستاروں کی مقررہ راہ پر گردش خدائے برتر کی قوت کا اظہار کرتی ہے۔ جب ملک شاہ تجھ سے کوئی کام شروع کرنے کے لیے نیک ساعت پوچھے یا یہ دریافت کرے کہ فلاں کام میں کامیابی ہو گی یا ناکامی تو اس کے زائچے کی مدد سے حساب لگانا اور یہ کوشش کرنا کہ کوئی اور اسے متاثر نہ کر سکے پھر یہ بھی یاد رکھنا کہ دوسرے بہت سے لوگ تیرے ہر کام کو حسد کی نظروں سے دیکھیں گے"۔

بجا فرمایا۔ عمر نے کہا۔ اسے یہ تجربہ تو ہو ہی چکا تھا۔ کہ جاسوس کسی نقل و حرکت کی کس طرح نگرانی کرتے ہیں۔ پھر اگر ملک شاہ نے بھی اس کے ستاروں کی علامتوں کا حساب لگانے کے لیے کہا تو یہ کام کرنا مشکل نہ ہو گا اور یہ حساب نجوم کے ان اصولوں کے مطابق جو کلدانیوں کے مینا روں کی طرح قدیم ہیں بآسانی نہ لگایا جا سکتا۔ اگر یہ علامتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں تو کیا ہوا؟ اگر ملک شاہ پوچھے گا تو یہ

علامتیں بلا کم و کاست اسے بتا دی جائیں گی۔

نظام الملک نے بے توجہی سے کہا ''ممکن ہے وہ کبھی کبھی وہ تجھ سے ان امور مملکت کے مطالب اور نتائج پوچھے جو میرے ہاتھ میں رہتے ہیں ایسے موقع پر تو میرے پیغام بھیج کر یہ معلوم کر لینا کہ کیا جواب دینا بہتر ہوگا۔ کیونکہ ان امور کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اور یہ منصوبہ بندی صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔

عمر نے نظام الملک کو تعجب کی نظروں سے دیکھا۔

نظام الملک مسکرایا اس کا دماغ کہیں اور معلوم ہوتا تھا وہ بولا ''خدا کے فضل سے حکومت کی باگ ڈور دو ہاتھوں میں ہے ایک ہاتھ تو بادشاہ کا ہے جو تاج پہنتا ہے اور دوسرا اس کے وزیر کا جس کے سر پر وزارت کی پگڑی ہے۔ بادشاہ جنگ کرتا ہے ملک فتح کرتا اور لوگوں کو سزائیں دیتا ہے اور انعام دیتا ہے اور وزیر کے ہاتھ میں نظم و نسق محصول کی وصولیابی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ حکمت عملی کا تعین ہوتا ہے۔ میں ملک شاہ کی ایمان داری سے خدمت کرتا ہوں لیکن بالآخر میرا فرض یہ ہے کہ نئی مملکت کا سنگ بنیاد رکھوں ..... اس لیے میں تجھ سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ حکمت عملی کے امور کے متعلق تو مجھ سے مشورہ کر لیا کر یہ بات طے ہے نا؟''

یقیناً عمر نے جواب دیا اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس سنجیدہ مزاج انسان نے جو ملک شاہ اس کی اپنی اور متعصب علماء کی نسبت زیادہ عقل مند تھا۔ اسے اپنا معتمد بنا لیا ہو۔ نظام الملک کی دیانتداری اتنی ہی غیر متزلزل تھی جتنا کہ سنگ مرمر کا وہ نیا ستون۔

نظام الملک نے پرسکون انداز میں جواب دیا ''اچھا تو تو نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے'' اسے دل میں جو خوشی محسوس ہو رہی تھی اس کا چہرے سے اس نے اظہار نہیں کیا۔ دو سال قبل جب سلطان الپ ارسلان کا اچانک انتقال ہوا تھا اسی وقت سے وہ اس فکر میں تھا کہ عمر کو تلاش کرے اور اس نوجوان سائنس دان کو اپنی سرپرستی میں لے کر ملک شاہ کا نجومی مقرر کرادے۔

اس نے توتوش سے کہا۔ ''اب ہم ملک شاہ کو اپنا ہم رائے بنانے کے لیے اس کا اثر استعمال کر سکتے ہیں'

لیکن عمر کی پہلی ہی درخواست نے نظام الملک کا یہ اطمینان چھین لیا۔ عمر نے اس سے کہا کہ منارے کی رصدگاہ میں جو مشاہدے کیے جائیں گے وہ معمولی نوعیت کے ہیں اور خواجہ اس کی اعانت کے بغیر محض دوسرے نجومیوں کی مدد سے ایک سال تک یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ اس عرصے میں میری خواہش تھی کہ میں سلطان ملک شاہ کے ہمراہ مغرب کے سفر پر جاؤں...... اور اصل واقعہ یہ تھا کہ اس سے اس سفر پر چلنے کے لیے خود سلطان نے کہا تھا۔

عمر نے نظام الملک کو یہ نہیں بتایا تھا کہ خود سلطان نے اس کو سفر پر جانے کی ترغیب دی ہے۔ اور نہ یہ بتایا تھا کہ مغرب کی سڑکوں پر میں یاسمین کو تلاش کروں گا۔ عمر کے پاس اب دولت اقتدار اور ملازمین اور شاہی عنایات غرضیکہ سب کچھ تھا اور وہ اپنی محبوبہ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

توتوش نے جب یہ خبر سنی تو وہ مسکرایا اور اس نے دل میں کہا ''میاں نظام! ایک

مرتبہ تم نے مجھے اس بات پر ڈانٹا تھا کہ خیمہ دوز کا یہ بیٹا میری نگرانی سے کیسے نکل بھاگا لیکن تمہاری سرپرستی میں آئے اسے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا کہ وہ سلطان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ بن کر پھر وہ راہ پیمائی کے لیے جا رہا ہے'' لیکن تو توش نے ظاہری طور پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظام الملک سے کہا۔

''قسمت میں یہی لکھا تھا''۔

حوالہ جات

ہو موسم گل اور بت حور سرشت
بھر بھر کے مجھے جام پلائے سرکشت
پھر چاہے کسی کو بھی مری بات نہ بھائے
میں کتے سے بدتر ہوں جو لوں نام بہشت

☆☆☆

باب سوم

تیز رو دریائے فرات کے ساحل پر بابل کے کھنڈروں میں ملک شاہ کا پڑاؤ
۔1075ء کی فصل بہار کا آغاز

عمر کو اپنی درباری زندگی میں سب سے پہلے خطرے سے اس وقت دوچار ہونا پڑا۔ جب سلطان کی فوجیں دریائے فرات کو عبور کرنے کے انتظار میں ساحل پر خیمہ زن تھیں۔

ان امراء کے خیمے جن میں عمر بھی شامل تھا جو سلطان کے مصاحبین میں شمار ہوتے تھے فرات کے ساحل پر کھجوروں کے باغ میں نصب کیے گئے تھے۔ ان خیموں کے پیچھے شکستہ دیواریں اور مٹی کے وہ ٹیلے تھے جو دراصل بابل کے کھنڈر تھے۔ عمر نے ان کھنڈروں کو دیکھنے میں کچھ وقت گزارا لیکن جب سلطان سیر و شکار میں مصروف نہ ہوتا تو وہ اپنے خیموں اور رقاصوں اور شعبدہ بازوں کے کرتب دیکھتا۔

بابل کے کنڈروں کے ایک صحن کو پردوں سے سجا دیا گیا تھا اور سنگ مرمر کے ایک زینے پر قالین بچھا کر بادشاہ اور اسکے مصاحبین کے لیے تخت بنا دیا گیا تھا۔ یہاں ایک روز شام کے وقت سلطان نے عمر کو طلب کیا۔

سلطان ملک شاہ نے گرم جوشی سے عمر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ''ستاروں کا مطالعہ کرنے والے ہامرے پاس بیٹھ کر ان کتوں کے کمالات دیکھو''۔

قالین پر ایک طرف عمر کے لیے نشست بنا دی گئی۔ تخت کے آگے رقص زور و شور سے جاری تھا۔ ناچنے والوں استاد اپنے گیت ایک نئی دھن میں گا رہا تھا۔ اس کے شانوں پر لگے گھنگھرو مخصوص تال میں بج رہے تھے۔ اور انگلیاں ڈھول پر تھرک رہی تھیں جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ جب وہ رقص کے دوران میں چکر لگاتا یا رکتا تو اس کے بال ماتھے پر لہراتے۔

ناچنے والوں کا استاد یکا یک رکا اور اس نے عمر کے سامنے آ کر انعام کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ ماتھے پر لٹکے ہوئے بالوں سے وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو دیکھ رہا تھا۔ عمر نے اس کی طرف ایک سکہ پھینک دیا۔ رقاص نے اس سکے کو کمال مہارت سے اپنی انگلی کی نوک پر گھمانا شروع کر دیا اور اس دوران کنکھیوں سے عمر کو دیکھتا رہا۔

رقاص نے چیخ کر کہا ''اے جادوگر! میں اولے برسا سکتا ہوں اور آندھیاں چلا سکتا ہوں۔ میں دل کا حال بھی بتا سکتا ہوں''۔

عمر نے مسکرا کر جواب دیا ''تب تو تو واقعی جادوگر ہے''۔

''برج جدی کے ستاروں کی قسم اس بکلی کی قسم جو ستاروں کا مطالعہ کرنے والے پر گرتی ہے میں جادوگر ہوں۔ تو سوچ رہا ہے کہ میں سخت بدمعاش ہوں۔ لیکن تو پھر بھی مجھ سے خوف زدہ ہے''۔

اس کی نگاہیں عمر کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور ملک شاہ اس وقت خوشی کے عالم میں تھا اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

''ستاروں کا حال بتانے والے اب تو میرے دل کا حال بتا۔ نہیں تو مجھے صرف اتنا بتا دیکہ تو میرے دل کا حال بتا سکتا ہے یا نہیں''۔

وہ اپنا بھدا رہلا کر عمر کو تکے جا رہا تھا۔ فوراً ہی وہ بولا بتا میں اس دربار سے کون سے دروازے سے باہر جاؤں گا دیکھ یہاں چار دروازے ہیں مشرقی، جنوبی، مغربی اور شمالی۔ تو اے ستاروں کا حال بتانے والے مجھے بتا میں کس دروازے سے نکلوں گا''۔

عمر اس کے سوال پر قہقہہ لگا کر ہنسا مگر ملک شاہ کو دیکھ رک وہ چونک پڑا۔ سلطان جھکا ہوا بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جیسے یہ رقاص اور شاہی منجم دو غنیم ہوں جن کے درمیان تلوار سے مقابلہ ہو رہا ہو۔

عمر نے آہستہ سے کہا ''یہ تو بہت معمولی بات ہے اور.....''

''لوگ کہتے ہیں کہ تو بڑا عاقل ہے بتا میں کس دروازے سے باہر جاؤں گا۔

دوسرے رقاص بھی اپنے استاد کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ اور سلطان کے مصاحب بھی گفتگو سننے کے لیے قریب آ گئے۔ ملک شاہ بڑے شوق سے عمر کے جواب کا منتظر تھا۔ عمر نے رقاص کو سمجھانا شروع کیا۔ کہ ستاروں ک مطالعے کا ایسی شعبدہ بازی سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ پوری بات کہہ بھی نہ پایا تھا جو اسے محسوس ہوا کہ سلطان کو یقین ہے کہ میں انسانوں کے خیالات بتا سکتا ہوں۔ اس نے سوچا کہ ملک شاہ کے اس اندھے عقیدے کو کسی استدلال سے بھی بدلا نہیں جا سکتا۔ عمر نے اپنے دل میں کہا کہ اب تو کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ آوارہ رقاص مجھے جال میں

پھنسانا چاہتا ہے۔ بس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ میں اس کی چالاکی حاضر دماغی سے کاٹ کروں۔

عمر نے بے چین ہو کر کہا..... میرے لیے ایک کاغذ اور قلم لاؤ''۔

ایک چوبدار آگے بڑھا اور اس نے مودب ہو کر عمر کو ایک کاغذ اور ایک واسطی قلم پیش کیا۔ عمر نے یہ چیزیں لے لیں لیکن وہ فکر میں غرق تھا۔ اسے چالاکی کا جواب چالاکی سے دینا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''اچھا تو یہ ہوتا ہے شاہی منجم کا فرض اگر میں ناکام ہوا تو ملک شاہ اسے کبھی نہیں بھولے گا۔ کاش میں اس دروازے کا صحیح اندازہ لگا سکوں رقاص نے کہا تھا چار دروازے ہیں۔ مشرقی جنوبی مغربی اور شمالی۔ چاروں میں سے کس دروازے سے..... یہ دروازے صاف نظر آ رہے ہیں اور ان سب دروازوں میں چوب دار ٹہل رہے ہیں..... لیکن رقاص نے یہ کیوں نہیں کہا کہ کس دروازے سے؟

عمر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اگر یہ رقاص شعبدہ بازی کر سکتا ہے تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ملک شاہ کی اجازت لے کر وہ زینے پر گیا اور ایک پتھر کا سرا اٹھا کر جو غالباً کسی مجسمے کا پائدان تھا اس نے مڑے ہوئے کاغذ کو وہاں رکھ دیا۔ اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رقاص سے کہا ''اب تم جاؤ''۔

رقاص کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور مشرقی دروازے کی طرف دوڑا۔ اس کے گھونگھرو بج رہے تھے۔ پھر وہ خوشی کا ایک نعرہ لگا کر گھوما اور دیوار کی طرف لپکا۔ زردوزی کا پردہ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹا جس کے پیچھے سے

دیوار کا ایک بغلی دروازہ نمودار ہوا۔

رقاص نے چیخ کر کہا ''میں اس دروازے سے جاتا ہوں'' رقاص کے جانے کے بعد پردہ گر گیا۔ تماشائیوں کی صفوں سے مدھم آواز میں خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ **ملک** شاہ نے چوبدار کو وہ کاغذ لانے کا حکم دیا تھا جو عمر نے پتھر کے نیچے دبایا تھا۔

پرچے کو سلطان نے آہستہ سے کھولا اور اس کی تحریر پڑھ کر تعجب سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر اس نے بلند آواز میں وہ پرچہ پڑھا۔

''پانچویں دروازے سے'' یا اللہ اے غیب کے حالات بتانے کے ماہر تو نے اس کے دل کا حال سچ سچ معلوم کر لیا''۔

عمر نے صرف قیافے سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جب یہ رقاص چار دروازوں پر اتنا زور دے رہا ہے اور جب اس کا امکان ہے کہ ان چار دروازوں میں سے اتفاقاً صحیح دروازہ بتا دوں تو یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دربار سے باہر جانے کا ایک اور دروازہ معلوم ہو حالانکہ دروازہ نظروں سے اوجھل ہے۔ بہر حال **ملک** شاہ سلطان جھکا اور اس نے اپنے نجومی کی کمر تھپک کر کہا کہ تو دوسرا بوعلی سینا ہے پھر اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ عمر کا منہ سونے سے بھر دیا جائے خزانچی فوراً سونے اور چاندی کی ڈلیوں سے بھرا ہوا تخت اٹھایا اور جو ہمیشہ سلطان کے قریب رکھا رہتا تھا اور یہ ڈلیاں عمر کے منہ میں بھرنا شروع کیں۔ پھر سلطان بولا اور اس کتے کے بچے رقاص کے منہ میں ریت بھر دو یہاں تک کہ وہ ریت سے اٹ جائے خدا کی قسم اس نے ہمارے آقائے

دانش سے گستاخی کی ہے"۔

فوراً ہی کچھ چوبدار سلطان کے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑے۔ جب عمر سلطان سے رخصت ہو کر چلا تو ایک غلام بڑی شان کے ساتھ سونے کے سکوں سے بھرا طشت لے کر اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ عمر نے دیکھا کہ دربار کے ایک دروازے پر لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس مجمع میں دو سپاہی رقاص کے بازو پکڑے ہوئے تھے تیسرا سپاہی چاقو سے اس بدمعاش کا منہ کھول رہا تھا۔ اور چوتھا سپاہی بورے سے ریت نکال نکال کر اس کے زخمی منہ میں بھر رہا تھا۔ رقاص کا چہرہ تکلیف سے سیاہ پڑتا جا رہا تھا اور بعض اوقات وہ درد سے بری طرح کراہتا ہے۔

عمر نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور کھجوروں کے جھنڈ میں اپنے خیمے کی تلاش میں روانہ ہوا۔ غلام بھی طشت لیے اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اس وقفے میں اس نے للچائی ہوئی نظروں سے اپنے کندھے پر سونے سے بھرے ہوئے طشت کو ایک نظر دیکھا۔

اس رات عمر دیر تک کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ حبشی غلام جو سونے کا طشت لے کر اس کے ساتھ آیا تھا روزانہ کی طرح خیمے میں نہیں سو رہا تھا۔ وہ اس جگہ لیٹا ہوا رینگ رہا تھا اور کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ اتنے میں خیمے کے دروازے پر ایک اور سایہ نظر آیا پھر وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے عمر کو اپنا مطالعہ ترک کرنا پڑا۔

عمر کو اٹھتا دیکھ کر غلام چیخ کر بولا۔ حضور یقیناً یہ جادو کی رات ہے۔ حضور آپ کا

غلام خوف زدہ ہو رہا ہے۔

دوسرے آدمی نے غلام کی ہاں میں ہاں ملا کر اور عمر کو سلام کر کے کہا ''ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم آقائے دانش کے قدموں میں بیٹھ سکیں۔ ہمیں رات سے ڈر لگ رہا ہے''۔

چراغ کے قریب کھسکتے ہوئے اس نووارد نے عمر کو بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ بابل کے کھنڈروں میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے ایک ٹیلے پر روشنی دیکھی۔ یہ چاند کی روشنی نہیں تھی کیونکہ جیسا کہ آقائے دانش کو علم ہے اس شب چاند نہ نکلا تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں روشنی کا ایک حالہ تھا جس میں ایک سفید پوش آدمی کی شکل نظر آ رہی تھی۔ نووارد نے کہا ''ٹیلے کے قریب پہنچا تو میں نے دو چیزیں اور دیکھیں..... ان میں ایک قریب قریب ننگا انسان تھا جو زمین پر سانپ کی طرح رینگ رہا تھا اور دوسرا ایک دیو پیکر بھورے رنگ کا عقاب تھا جو روشنی کے اس ہالے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

حبشی غلام جس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن متاثر اتنا ہی تھا جیسے خود دیکھا ہو چیخ کر بولا۔ واہ یہ روشنی سب سے اونچے ٹیلے پر تھی اور سفید پوش اس عقاب سے باتیں کر رہا تھا۔ عقاب اسی دوران سانپ بن گیا۔ اس کے پاس ایک چاقو بھی تھا۔ ارے ارے وہ تو عجیب جادو تھا۔ اور ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔

نووارد نے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے کہا ''وہ شخص جو رینگ رہا تھا رقاص تھا جس کے منہ اور پیٹ میں ریت بھرا ہوا تھا۔ آقائے دانش نے انہیں آپ کا نام بھی

لیتے سنا تھا انہوں نے عجیب جادو دکھایا۔

''کہاں؟''

سامنے اس اونچے ٹیلے پر''۔

غالباً اس غلام نے ٹیلے پر رقاص کو دفن کیے جاتے دیکھ لیا ہوگا..... پھر بھی عمر یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ خوف زدہ حبشی غلام رات بھر اس کے پاس بیٹھے رہیں۔ چنانچہ وہ ٹیلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور نووارد بھی بادل نخواستہ اس کے پیچھے پیچھے چلا اور حبشی غلام تو اس کے اتنے قریب چل رہا تھا کہ عمر کے قدم پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ خیمے سے روانہ ہونے کے بعد وہ شکستہ دیواروں کی طرف جانے والے راستے پر مڑے یہاں تک کہ عمر اس جگہ پہنچا جو کسی زمانہ میں ایک چوڑی سڑک رہی ہوگی۔ نووارد یہاں آ کر اپنے چراغ کی روشنی تیز کرنے کے لیے اسے ہلانے کے بہانے ٹھہرا۔ اس نے عمر سے آہستہ کہا حضور وہ جگہ یہاں سے کچھ ہی دور ہے وہاں دائیں طرف آپ کا غلام آپ کا یہ غلام یہیں ٹھہر کر انتظار کرے گا.....''۔

عمر نے نووارد سے چراغ لے لیا اور آگے بڑھا جلد ہی اس کے کانوں میں پھاوڑا چلانے اور کسی کے زمین کھودنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں غلام اس کھنڈر سے بھاگ کر واپس جا رہے تھے وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ اور عمر تنہا دونوں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ اونچائی پر ایک مدھم سی روشنی کی نظر پڑی۔

یہ روشنی اس کھنڈر پر تھی جسے لوگ مندر کہتے تھے۔ عمر نے دن میں یہ جگہ دیکھی تھی

اور وہ جانتا تھا کہ یہاں سے ریت کے ٹیلوں پر کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب وہ ٹیلے پر پہنچ گیا تو اس نے اس روشنی کی طرف بڑھنا شروع کیا جو شکستہ دیوار کے ایک طاق پر نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی کے ہالے میں بیٹھا ہوا آدمی عمر کو دیکھ کر اس انداز سے اٹھا جیسے وہ اس کی آمد کا منتظر ہو۔

وہ بولا ''ایک جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے''۔

وہ شخص خیام سے پستہ قد تھا۔ اس کی بھنوئیں گھنی اور ڈاڑھی گھنگھریالی تھی۔ عربوں کی طرح وہ اپنے شانے پر سفید رومال ڈالے ہوئے تھا۔ لیکن چہرے سے عرب نہیں معلوم ہوتا تھا۔

زمین کی طرف اشارا کرتے ہوئے اس نے عمر کو ایک لاش کی طرف متوجہ کیا۔ یہ لاش رقاص کی تھی۔ اسکے سینے میں چھرا کھونپا ہوا تھا۔ وہ شخص بولا ''میں نے اس کے دکھ کا خاتمہ کر دیا''۔

عمر نے اس شکاری پرندے کو دیکھا جو قریب ہی اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسے خیال ہوا کہ یہ پرندہ باز وغیرہ ہو گا۔ لیکن وہ عقاب تھا جب عمر اسکے قریب پہنچا تو عقاب نے پر پھڑ پھڑانے بند کر دیے۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے عمر کو تک رہا تھا۔

اس شخص نے کہا ''یہ میرا رفیق ہے جو اونچے مقامات میں میرے ساتھ رہتا ہے..... اور آسمان کی بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے''۔

تو کون ہے؟

''پہاڑوں کا رہنے والا اور رے کا باشندہ'' اس شخص نے یہ جملی اپنی ٹھوڑی کو

آگے کرتے ہوئے کہا اور اس کی چمکیلی آنکھیں اور چمک اٹھیں۔

رے کا قدیم شہر ان پہاڑوں کی ترائی میں واقع تھا جو ایران کی بلند ترین اور برف پوش چوٹی دی آوند کے گرد پڑتی تھی۔ اگرچہ اس شخص کا ایرانی ہونا بھی ممکن تھا۔ لیکن اس کا لہجہ مصریوں کا سا تھا۔ اور آواز کے لوچ سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کئی زبانوں سے واقفیت حاصل ہے۔

اس نے عمر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''تو خیام ہے بادشاہ کا منجم۔ تجھے سکون حاصل نہیں..... اسی وجہ سے تو یہاں ایسر کے مندر میں ایک ایسے طالب علم سے باتیں کرنے آیا ہے جسے بہت سے لوگ پاگل سمجھتے ہیں۔ میرا نام حسن بن صباح ہے۔

''حسن بن صباح تم عجیب طریقے سے تدفین کرتے ہو''۔

''واللہ یہ تدفین نہیں یہ کام تو میں نے غلاموں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میرا کام تو ہو چکا''۔

'تم طالب علم ہو..... کیا تم مرنے والوں کا مطالعہ کرتے ہو؟''

حسن غور کر رہا تھا جیسے وہ اپنے ذہن میں کوئی نئی بات سوچ رہا ہے وہ عمر سے سن میں کسی قدر بڑا تھا۔ اس کی آواز اور اس کے قوی ہاتھوں میں حیوانوں کی سی سختی اور طاقت تھی اس نے جواب دیا ''میں حقیقت کی تلاش میں ہوں اور بہت سی چیزوں کی حقیقت کی جستجو رکھتا ہوں۔ میں نے اس رقاص کو سلطان کے دروازے کے باہر پڑا دیکھا۔ جہاں اسے کتوں کے چیرنے پھاڑنے کے لیے پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے

میں اسے یہاں ٹیلے پر لے آیا۔ یہاں عقاب اس کا گوشت کھا کر اپنی ہڈیاں صاف کر دیں گے۔ اس درد دے نجات دلانے کے لیے میں نے اس کے سینے میں چھرا گھونپ دیا۔ حالانکہ خیمے کا ہر شخص اسے مارتے ڈرتا تھا کیونکہ **ملک** شاہ نے اس احمق رقاص کے منہ میں صرف ریت بھرنے کا حکم دیا تھا..... لیکن سب سے بڑھ کر مجھے دوستوں کی اور سچے دوستوں کی تلاش ہے۔ اسی لیے میں عرصے سے بابل میں مقیم ہوں"۔

حسن بن صباح کسی دین دار مسلمان یا درباری سے کے لہجے میں گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ عمر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید وہ خود **ملک** شاہ کا کوئی معتمد ہو۔ حسن نے بے ساختہ اس سے پوچھا "کیا آپ نے کبھی کسی نشان کے ظاہر ہونے کا انتظار کیا ہے؟"

عمر نے جواب میں اس سے یہ سوال کیا "صباح کے بیٹے! کیا تم نے بھی بابل میں کوئی نشانی دیکھی ہے؟"

"ہاں جب یہ رقاص مرا تھا اس وقت کیونکہ اب اور اس لمحے میری ملاقات اس آدمی سے ہوئی ہے جو اپنے خیالات میں واضح اور حقیقت کا جویا ہے۔ اے خدا کاش عمر خیال میرا دوست ہو سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسا ہونا مقدر ہو چکا ہے..... لیکن ستارے ڈوب رہے ہیں اب رات بہت ہوگئی اور میں ٹیلے سے نیچے اترتا ہوں"۔

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ چراغ بجھ گیا۔ لیکن حسن کو کوئی پریشانی محسوس نہ ہوئی۔ اس

نے کہا کوئی بات نہیں اس کھنڈر کی بھول بھلیوں سے اتنی ہی اچھی طرح واقف ہوں جتنی اچھی طرح رند میخانے سے واقف ہوتا ہے۔ اس نے عمر کا ہاتھ پکڑا اور تنگ راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ ایک بات وہ ٹیلے پر ایسی جگہ پہنچے جہاں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ لیکن حسن لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑھتا ہی چلا گیا۔ عمر نے پیچھے سے عقاب کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنی جیسے وہ ان کے ساتھ آ رہا ہو۔ پھر کوئی الوداعی کلمہ کہے بغیر ہی حسن نے عمر خیام کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اس کے ساتھ پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز بھی دور اندھیرے میں مدھم ہوتی چلی گئی۔

اپنے خیمے میں پہنچ کر عمر نے دیکھا کہ چراغ کے قریب غلام سمٹے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

سونے سے پہلے کچھ دیر تک عمر اپنی اور حسن کی ملاقات پر غور کرتا رہا۔ عمر نے سوچا کہ حسن عجیب انسان ہے۔ اسے میرے وہاں پہنچنے کی توقع بھی تھی..... وہ نووارد غلام جو اس کے خیمے میں یہ قصہ سنانے آیا تھا غائب ہو چکا تھا..... اور اس کی ایک انجانے اور انوکھے طریقے سے آزمائش کی گئی تھی۔

بلاشبہ وہ روشنی تو اس چراغ کی تھی جسے ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ لیکن ہرن کے شکار کے علاوہ کون عقاب کو سدھاتا ہے؟

اس کے بعد عمر نے کئی مرتبہ فوج کے سپاہیوں سے اس حسن بن صباح کا حال پوچھا جو مصریوں کے لہجے میں بولتا تھا لیکن اس کا کوئی جاننے والا نہ ملا۔

وادی جہنم کے آگے بیت المقدس کی مشرقی شہر پناہ کے مقابل ایک ٹیلا.....

چھوٹی چھوٹی باتوں سے عمر کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نظام الملک اتنے فاصلے سے بھی اس پر نگاہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد پھر کبھی عمر کے سامنے کسی آوارہ شعبدے باز کو آنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جب وہ خیمے میں تنہا ہوتا تو ایک ہندو منشی اس کے پاس آتا اور بلخ و سمرقند کے معاملات اور ملک شاہ کی جملہ کارروائیوں پر بات چیت کیا کرتا۔

اور سب سے زیادہ مددگار وہ خطوط تھے جو نظام الملک خود اسے لکھا کرتا تھا۔ بظاہر ان خطوط میں نظام الملک اپنے کام کے حالات لکھتا تھا لیکن دراصل یہ بحث ہوتی تھی کہ کون کون سے لائحہ عمل اختیار کیے جائیں اور کن خطرات سے بچا جائے۔ ان خطوط ہی سے عمر کو یہ معلوم ہوا کہ ملک شاہ کی فوجوں کے لیے بیت المقدس لینا کتنا ضروری تھا۔ ملک شاہ خلیفہ بغداد کا جسے کروڑوں مسلمان اپنا پیشوا مانتے تھے منظور نظر بن چکا تھا اور سلجوق ترک مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے انہیں بیت المقدس کو مصر کے بدعتی خلیفہ کے ناجائز قبضے سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا کام ابھی باقی تھا۔

توسیع سلطنت ہی کے مقصد سے ملک شاہ کو شمال میں کافر بازنطینوں کے خلاف بھی فوج کشی کرنے کی ضرورت تھی۔ جب تک اسلام کا یہ مجاہد جہاد کے راستے پر چلتا رہے گا' اس وقت تک اسے اپنی فوج کے لیے سپاہیوں کی کمی نہ ہو گی..... کوہستانی

علاقوں سے مزید ترک قبائل کے سوار دستے نیشاپور پہنچ رہے تھے اور نظام الملک انہیں فوج میں شامل ہونے کے لیے مغرب کی جانب روانہ کر رہا تھا۔

اب عمر کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ نظام الملک کی حیثیت اس کاریگر کی سی ہے جو اپنے کھرگے پر بیٹھا' بظاہر بے معنی انداز میں ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بنتا رہتا ہے' لیکن اصل میں یہ ٹکڑے ایک قالین کے مجموعی نقشے کا جزو ہوتے ہیں۔

چنانچہ **ملک** شاہ نے جب اس سے یہ مشورہ کیا کہ بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لیے ساعت نیک ہے یا نہیں تو عمر نے کسی پس وپیش کے بغیر کہا یقیناً یہ مہینہ نہایت مبارک ہے اور مریخ کا سیارہ آپ کے سیارے کا حامی ہے"۔

ملک شاہ بخوبی جانتا تھا کہ یہ بات درست ہے' لیکن وہ اپنے منجم پر اس قدر بھروسا کرتا تھا کہ اگر عمر اعتراض کرتا تو **ملک** شاہ اپنا منصوبہ بند ڈالتا۔

اس وقت سلطان کی فوجیں حیفہ کے سرخ میدان میں خیمہ زن تھیں عمر نے یہ طے کیا کہ وہ امیر عزیز کی سوار فوج کے سات جو بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کی جا رہی تھی جنوب کا سفر کرے گا.....

عمر مغربی سمندر دیکھنا چاہتا تھا.....اس نے اپنی زندگی میں سمندر کا ساحل کبھی نہ دیکھا تھا اور وہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی زیارت بھی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ **ملک** شاہ پر ظاہر کیا۔ اس دوران میں عمر حیفہ نیز ان تمام شہروں کے بازاروں میں جو راستے میں پڑے تھے مشہد کے اس پارچہ فروش کی بے سود تلاش میں مصروف تھا جو ایک نوجوان بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ خفہ سے بہت سے کارواں جنوب کی طرف دمشق جاتے اور وہاں سے مصر کے ریگستان کو عبور کرتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے جنوبی سڑک پر یا یمین کا کچھ پتا مل جائے۔ عمر نے اپنے دل میں کہا کاش مجھے اطلاعات حاصل کرنے کے لیے توتوش کے سے ذرائع حاصل ہوتے۔

''اچھا تم زیارت کے لیے جاؤ تو میرے لیے مسجد اقصیٰ کی محراب میں دعا کرنا'' ملک شاہ نے اسے روانگی کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان ترک سلطان نے اس بات کو نہایت مناسب سمجھا کہ وہ خیام جسے خدا نے علم و دانش سے نوازا ہے۔ اس فوجی مہم کے دوران میں زیارت سے مشرف ہو' لیکن اس نے عمر کو اجازت دینے سے قبل یہ احتیاط کری کہ اس عرصے کے لیے جس میں عمر کو باہر رہنا تھا اس سے سعد اور نحس دنوں کا نقشہ بنوایا۔ ملک شاہ کی راس میں مریخ' زحل اور مشتری تینوں ستارے جمع تھے اس لیے اس زمانے میں اہم واقعات پیش آنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ سلطان نے عمر خیام کو سفر پر لے جانے کے لیے شاہی نشان اور نصف درجن حبشی غلاموں کا محافظ دستہ بھی دیا۔

اس دستے کے افسر بمباشی کو سلطان نے یہ حکم دیا کہ اس کے دو آدمی سوتے جاگتے عمر کی حفاظت کریں۔ چنانچہ عمر جہاں بھی جاتا دو مستعد تیر انداز ہمیشہ اس کی حافظت کے لیے ساتھ ہوتے' کیونکہ بمباشی نے اپنے سپاہیوں کو بتا دیا تھا کہ جس شخص کی نگاہ سے عمر اوجھل ہوا اس کا سر اڑا دیا جائے گا۔ لیکن عمر انہیں ایسی ایسی گلیوں میں لے گیا جن کی وہ توقع بھی نہ کر سکتے تھے۔ دمشق سے جہاں اس نے بازار کا

گوشہ گوشہ چھان مارا وہ انہیں لبنان کے چناروں سے ڈھکے ہوئے میدان میں لایا اور وہاں سے ہرمان کی بلند اور چمکدار برف پوش چوٹی کے قریب گزرتا ہوا پھر انہیں ساحل سمندر کی طرف لے آیا۔

عمر گھنٹوں سمندر کے ریتلے ساحل پر ٹہلتا۔ بحری ہوا میں سانس لیتا اور وہ عجیب وغریب اشیاء اٹھا اٹھا کر دیکھتا جنہیں موجیں ساحل پر پھینک دیتی تھیں۔

یہ اسی عظیم سمندر کا ساحل تھا جہاں یونانی اور رومی اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعے پہنچے تھے اور جہاں انہوں نے سنگ مرمر کی وہ بندرگاہیں بنائی تھیں جو اب تقریباً ویران پڑی ہیں۔ یہیں طیر کی وہ سرزمین تھی جو دور تک سمندر کے اندر چلی گئی تھی اور اس جگہ سد سکندری تھی جس کی بنیادیں اب تک پانی میں نظر آتی ہیں۔ عمر کوہ قرمل کی ان بلندیوں پر بھی چڑھا جہاں بہت سے عیسائی راہبوں نے حیات وموت کی منزل طے کی تھی۔

اس کے بعد عمر میدانوں کی طرف بڑھا اور پہاڑوں کی اس ڈھلان پر پہنچا جہاں کسی زمانے میں جھیل تھی۔ حبشی غلاموں کے دل میں یہ خیال تھا کہ اس وادی میں زمین کے اندر شیطان دفن ہیں کیونکہ وہاں گندھک کے چشمے ویران محل کی دیواروں کی پچی کاری اور بہ بارلیش غم زدہ لوگ نظر آرہے تھے جنہیں یہودی کہا جاتا ہے۔

لیکن جب وہ بیت المقدس پہنچے تو انہیں مانوس ماحول میسر آ گیا۔ سلطان کی فوج نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد دیہاتی کافروں کو لوٹا تھا۔ وہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے

روندے ہوئے کھیتوں خانقاہوں کی ان سیاہ دیواروں کے پاس سے گزرے جنہیں لوٹ کر آگ کی نذر کر دیا گیا تھا۔

کبھی کبھی انہیں کچھ عجب قسم کے لوگ نظر آتے ..... برہنہ سر مرد اور بچوں کو گود میں لیے ہوئے بے نقاب عورتیں ..... یہ لوگ لاشوں کے ڈھیر دفن کرنے کے لیے قبریں بناتے دکھائی دیتے۔

سڑکوں پر انہیں غلاموں کے وہ قافلے ملتے جنہیں تاجروں نے جانب شمال' دمشق پہنچنے کے لیے ترک سپاہیوں سے خریدا تھا۔ اسی وقت عمر کو خراسان کی سڑک پر زوئی اور زیر ماق کے ساتھ سفر کرنا یاد آجاتا۔

عمر **ملک** شاہ کے سپہ سالار امیر عزیز کے خیمے میں ٹھہر گیا کیونکہ اسے بمباشی نے یہ رائے دی کہ رات کے وقت بیت المقدس کے اندر قیام کرنا محفوظ نہ ہوگا۔ بہر حال دن کے وقت عمر مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنے گیا جو جنگ کے اثر سے بالکل محفوظ رہی تھی۔

عمر نے دیکھا کہ مسجد کے مرمریں احاطے میں ان ملاؤں کا ہجوم ہے جو فوج کے ساتھ آئے تھے اور جو اب اقصیٰ پر قابض ہو گئے ہیں۔ منبر پر بیٹھا ہوا امام خلیفہ بغداد اور سلطان **ملک** شاہ کا خطبہ پڑھ رہا ہے۔ مصری مولوی شہر چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ ہجوم سے بچنے کے لیے عمر مسجد کے گنبد میں چلا گیا۔ یہاں کھڑکیوں کے شیشوں پر رنگ ہونے کی وجہ سے کچھ اندھیرا سا تھا اور خاموشی بھی۔ یہاں عمر نے اس پتھر کو بوسہ دیا جو مسلمانوں کے نزدیک سنگ اسود کے بعد سب سے متبرک ہے۔ نیم کافر

حبشی سپاہی بھی اس کے ساتھ احتراماً سجدے میں جھک گئے لیکن وہ گنبد کے مرمریں ستونوں اور سنہری پچی کاری کو بڑے تعجب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

جب عمر سجدے سے اٹھا تو کسی نے آہستہ سے اسے سلام کیا اور کہا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ''۔

''وعلیکم السلام'' عمر نے جواب دیا۔

اس نے دیکھا کہ حسن بن صباح ایک شخص کو ساتھ لیے ہوئے اس کے قریب ہی کھڑا ہے۔ اس مرتبہ حسن زائروں کا سا لباس پہنے تھا اور اس دفعہ اس نے عربی زبان میں جس میں اسے اتنی ہی مہارت تھی جتنی کہ فارسی میں بات چیت شروع کی۔

اس نے مسکرا کر کہا 'الحمد اللہ کہ اس نے مجھے میرے دوست سے پھر ملا دیا۔ کیا تم یہ معلوم کرو گے کہ پتھر کے اس گنبد میں پتھر کے سوا اور کیا ہے''۔

سب لوگ حسن کو دیکھنے لگے۔ حسن میں یہ وصف تھا کہ جب وہ بولتا تھا تو ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا۔ لوگ اس کے اور قریب آ گئے اور اس نے انہیں سمجھانا شروع کیا کہ اس پتھر پر جو نشان ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش پا ہے۔ یہ نقش پتھر پر اس وقت بنا تھا جب آنحضرتؐ اس مقام سے عرش پر تشریف لے گئے تھے۔ اور اس پتھر کے کناروں پر جو سوراخ ہیں وہ حضرت جبرائیل کی انگلیوں سے اس وقت بنے تھے جب انہوں نے اس پتھر کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے سے روکا تھا۔ حبشی سپاہی اس معجزے کا ثبوت دیکھنے کے لیے اور قریب آ

گئے اور تعجب سے بلند آوازیں نکالنے لگے۔

حسن نے بتایا کہ ''نیچے وہ غار ہیں جہاں قیامت کے دن روحیں جمع ہوں گی۔ آؤ میرے پیچھے آؤ!''

اس نے ایک چراغ جلایا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن ہر چیز سے واقف ہے۔ حسن نے ایک مولوی سے اس غار میں اترنے کی اجازت مانگی اور سرگوشی کے انداز میں وہاں کچھ روحانی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا۔ حبشی سپاہی جو خود اور زرہ بکتر پہنے تھے خوف زدہ ہو گئے' لیکن حسن کے ساتھی نے جو ایک توانا شخص تھا اور کفتان پہنے تھا' عمر سے کہا کہ اس غار میں تو بمشکل بیس سے زیادہ روحیں نہ آسکیں گی تاوقتیکہ وہ ذات سے بھی چھوٹی نہ بن جائیں۔

حسن اس زیارت گاہ کے اندر داخل ہوا۔ وہ چراغ کو ایک ستون کی آڑ میں کیے ہوئے تھا۔ وہ بولا عرصہ ہوا کہ اسلام کے ایک خلیفہ نے حضور نبی کریمؐ کے انتقال کے بعد ان الفاظ کو سنہری حرفوں میں لکھوایا تھا سامنے دیکھو!''

اور عمر نے دیکھا کہ خط کوفی میں کوئی عبارت تحریر ہے لیکن وہ اس کو آسانی سے پڑھ نہ سکتا تھا۔ حسن نے یہ عبارت روانی سے پڑھ کر سنائی۔

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کا کوئی شریک ہے..... یقیناً ابن مریم اللہ کے پیغمبر ہیں۔ لہٰذا خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو اس میں تمہارے لیے بہتری ہے''۔

حسن نے عمر کا شانہ پکڑ کر کہا ''جب یہ الفاظ لکھے گئے ہیں اور انہیں بہت کم

لوگوں نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے تو ان سے بھی کم لوگوں نے ہے..... لیکن ان کا مطلب کس نے سمجھا ہے؟ لیکن تم یاد رکھنا اور غالباً تم ان کا مطلب سمجھو گے"۔

پھر حسن ہجوس کچھ پریشان سا ہو گیا اور وہاں سے عمر خیام کو لے کر چل دیا۔ وہ اسے شہر کی تنگ گلیوں میں لے گیا۔ حسن راستے میں عمر کو وہ چیزیں دکھاتا جاتا تھا جن پر کسی اور کی نظر نہ پڑتی۔ حسن کا ساتھی ان کے پیچھے پیچھے اپنے خیالات میں غرق چل رہا تھا۔

حسن نے ایک جگہ ٹھہر کر کہا "یہ وہ محراب اور کھڑکی ہے جہاں سے سلطنت روما کے اعلیٰ احکام نے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں سے اس وقت گفتگو کی تھی جب حضرت عیسیٰ روح اللہ کو دار پر چڑھانے کے لیے سپاہیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اب اس پہاڑی کو جس پر صلیب نصب کی گئی تھی عیسائیوں نے بھلا دیا ہے"۔

حسن بن صباح مسلح ترک دستوں کو ہٹاتا اور سڑکوں پر مال غنیمت کے متعلق بحث کرتا جاتا تھا' اس نے مسکرا کر کہا کہ ہمیشہ سے بیت المقدس کا یہ مقدر رہا ہے کہ بادشاہوں کی فوجیں اسکی شہر پناہ کو توڑیں اور اس کے باشندوں کا قتل و خون کریں۔ جی ہاں! تھوڑی ہی مدت میں اور ہمارے آقا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر زندگی میں فارس کے بادشاہوں نے یہودیوں کے اکسانے پر اس شہر کو تباہ کیا اور پھر قیصر روم ہرقل کی فوجوں نے دوبارہ اس شہر کو واپس لے لیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے یہودیوں کا زبردست کشت و خون کیا۔ ہمارے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ جب اس شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پر امن طریقہ اختیار کیا اور کشت و خون سے دامن

بچایا۔ حرم کے پتھر کو تم دیکھ چکے ہو انہوں نے اس کو گندگی اور کوڑے کرکٹ سے صاف کیا۔ حقیقت میں یہ وہی پتھر ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے معبد میں لگا ہوا تھا۔ لیکن اب ان ترکوں نے جہالت کے باعث قتل و غارت کی۔ ان کی حکمرانی دیرپا ثابت نہ ہوگی کیونکہ نئے غنیم ان سے یہ شہر چھین لیں گے''۔

اس کے ساتھ نے پوچھا ''کون سے غنیم؟''

حسن بن صباح نے جھنجلا کر جواب ''یہ راز تو غیب کے پردے میں ہے میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے بیت المقدس چھن جائے گا۔ جی ہاں! کوئی نیا زبردست غنیم ان سے یہ شہر چھین لے گا۔ کیونکہ انہوں نے یہاں جنگ کی ہے۔ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں۔ یاد رکھو کہ اس میں تمہارے لیے بہتری ہے' لیکن حق بتانے والی تحریر پر کون توجہ کرے گا؟''

اس وقت عمر کے ذہن میں نظام الملک کا جو سلطنت کا تاروپود بنانے میں مصروف تھا اور سلطان ملک شاہ کا خیال آ رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے ننگے سر لوگوں کو اپنے مردے دفن کرتے ہیں یا خانقاہوں کی جلی ہوئی دیواروں کے منظر میں نہیں دیکھے تھے۔ حسن کے پرجوش الفاظ سے وہ بہت متاثر ہوا۔

دوسرے آدمی نے سنجیدگی سے کہا ''ہمیں معلوم ہے کہ انسان تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ ایک یہودیوں کا خدا یوحنا ہے۔ دوسرا عیسائیوں کا خدا ہے اور تیسرا قرآن شریف کا اللہ ہے''۔

حسن نے جواب دیا ''تین مرتبہ تو نے ایک ہی خدا کا نام لیا ہے۔ اگر ایک ہی خدا کو مانا جائے تو کیا حرج ہے۔ کاش یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کو اس حقیقت کا بھی کچھ ادراک ہوتا کہ اللہ سے بھی بڑی ایک ہستی ہے..... (نعوذ باللہ)''

حسن یکا یک بولتے بولتے رک گیا اور اپنے اردگرد ایک متجسس نظر ڈال کر انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

اب کی مرتبہ وہ انہیں پھر حرم کی طرف واپس لے چلا لیکن اس دروازے سے نکلنے کے لیے مڑا جو مشرق کی جانب کھلتا تھا۔ وہ اس قبرستان میں پہنچے جو شہر پناہ سے بالکل ملا ہوا تھا یہ راستہ ایک چٹیل وادی کے اندر جاتا تھا اور اسکے قریب ہی ایک خشک نالے کے کنارے سلطان کے سپاہی ان بھیڑ بکریوں کو ہنکا کر لے جا رہے تھے جنہیں وہ دیہات سے لوٹ کر لائے تھے۔ عمر کے محافظ سپاہیوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ بھیڑوں کے گلے کے درمیان سے گزرنا چاہتا تھا آگے بڑھ کر بھیڑوں کو ہٹایا اور راستہ بنانے کی کوشش کی۔ سلطان کی فوج کے سپاہیوں نے عمر کے محافظوں کی وردی دیکھی تو وہ بھی ان کی مدد کرنے لگے۔

حسن بن صباح کے ساتھی نے عمر سے مسکرا کر کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی فوجیں تمہاری غلام ہیں'' یہ شخص بھاری جثے کا آدمی تھا اور بھاری بھاری قدموں سے چلتا تھا اس کی آنکھوں سے تجربہ کاری اور چالاکی ٹپکتی تھی۔ وہ جچے تلے انداز میں بولتا تھا اور اس کی باتوں سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا محال تھا۔ حسن بن صباح اسے اقرونوس کہہ کر پکارتا اور یہ کہا کرتا تھا کہ وہ تمام تاجروں کا دادا ہے۔

حسن نے اپنے ساتھی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ''کیوں نہیں، جب کہ فوجیں سلطان کا حکم مانتی ہیں اور استاد عمر سلطان کو منصوبہ بنا کر دیتا ہے؟ عمر صرف شاہی منجم ہی نہیں بلکہ وہ نوجوان سلجوقی بادشاہ کا خاص مشیر اور پیشین گوئی کرنے والا بھی ہے''۔

اقرونوس نے عمر کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے وہ اسے نگاہوں میں تول رہا ہو۔ وہ ایک پتھریلی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ان کے راستے میں زیتون کے درختوں کا ایک جھنڈ بھی پڑا۔ ان بل کھائے ہوئے درختوں میں انہوں نے ایک عیسائی پادری کی لاش دیکھی۔ پادری سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ صلیب کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور منڈا ہوا سفید سر پتھروں میں چمک رہا تھا۔

حسن نے کہا ''یہ عیسائیوں کی عبادت گاہ معلوم ہوتی ہے جس پہاڑی پر ہم چڑھ رہے ہیں اسے کوہ زیتون کہتے ہیں''۔

شام کے سورج کی کرنیں بے آب و گیاہ پہاڑی پر چمک رہی ہیں یہ تینوں آدمی پہاڑی پر خاموش بیٹھے تھے اور ان کے سامنے وادی میں آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی شکلیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ دور مسجد اقصیٰ کا مینار سورج کی سنہری شعاعوں میں چمک رہا تھا۔

عمر جانتا تھا کہ اس وادی کا نام وادی جہنم ہے۔ اور مولویوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال کا حساب کتاب ہوگا تو جن لوگوں کو جہنم میں جانا ہوگا ان کی روحیں اسی وادی سے گزریں گی۔ نیچے ڈھلان پر اسے عجب شکل کی قبریں دکھائی

دے رہی تھیں ان قبروں پر اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ سورج آگ کے گولے کے مانند سرخ ہو گیا تھا اور بیت المقدس کے میناروں کے قریب ڈوبتا نظر آ رہا تھا۔

ان کے قریب کچھ بوڑھے قطار باندھے آہستہ آہستہ پہاڑی سے وادی میں اتر رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص اپنے آگ والے کا کپڑا یا کندھا پکڑے ہوئے تھا اور وہ ٹھوکریں کھاتے اور گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کا سر آسمان کی طرف تھا اور کوئی سر جھکائے تھا کیونکہ یہ سب اندھے تھے۔

حسن یکا یک چیخ کر بولا "دیکھو وہ ہمارا قافلہ جا رہا ہے۔ ہاں ہم آسمان کو دیکھتے ہیں اور اندھی آنکھوں سے زمین کو ٹٹولتے ہیں۔ کاش ہمیں حقیقت کا علم ہو سکتا!"

اقرونوسی نے بڑبڑا کر کہا "ہمیں کافی معلومات ہیں"۔

حسن نے سورج کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں وہ بولا "نہیں ہم اندھے ہیں۔ ہمیں صرف گزشتہ کے متعلق علم ہے۔ پرانے پتھروں اور مدفون ہڈیوں کے علاوہ ہمارے نزدیک اور کیا چیز متبرک ہے؟ اگر قرآن شریف کے بتائے ہوئے اللہ سے بھی بڑا کوئی اللہ ہے تو کیا ہو؟" (نعوذ باللہ)

اقرنوس خاموش تھا۔ وہ انگلیوں سے اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کر رہا تھا اور عمر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ گیند کو دیکھنے میں محو تھا۔ لیکن حسن بن صباح اس وقت تقریر کرنے کے جوش میں تھا۔ وہ ایک نئے خدا پر اعتقاد رکھتا تھا جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی۔ اس نے کہا کہ ماضی کے تمام مذاہب اس آخری منزل پر پہنچنے کے زینے ہیں۔ کسی حد تک ہر مذہب کے انسانوں کو علم کی روشنی دی ہے اور اسی طرح ان

چھ نبیوں ن بھی جن کے نام آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آ جائے جب ساتواں نبی پیدا ہو اور آخری حقیقت کو ظاہر کرے''۔

''لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ نبی ہے؟'' اقرنوس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

یہ معلوم ہو جائے گا کیونکہ ماضی میں جب اس کے ظہور کا وقت نہ تھا وہ ہمارے ساتھ رہ چکا ہے۔ وہ امیر المومنین علی المرتضیٰ کی نسل میں ساتواں امام ہوا ہے اور شیر خدا کے روحانی اوصاف کا وارث ہے۔ کچھ لوگ اسے ساتویں امام اور کچھ اسے نقاب پوش کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ امام غائب مہدیؑ ہے جس کا ہمیں انتظار ہے''۔

سورج شہر کی دیوار اور میناروں کی آڑ میں ڈوب چکا تھا۔ اقرونوس نے ایک سرد آہ بھری۔

حسن نے تقریر کا سلسل جاری رکھا اور کہا کہ ''مہدی اس وقت بھی موجود تھا جب اس سرزمین پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ید بیضا اور روح اللہ نے دم عیسیٰ کے معجزے دکھائے اور وہ پھر آئے گا''۔

پیچھے سے کسی شخص کے چلنے کی آواز آئی۔ عمر کے محافظ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے جو حسن کی عالمانہ گفتگو کے دوران اونگھتا رہا تھا بے پروائی سے کہا کہ اب خیمے کو واپس چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ حسن مسکرایا۔ اس کی طبیعت بھی اب واپس جانے کو چاہ رہی تھی۔ اس نے جواب دیا ''سپاہی خواہ وہ روسی ہو یا ترک۔ آخری

فیصلہ اسی کے ہاتھ میں رہتا ہے''۔

عمر اپنے خیمے میں واپس پہنچا منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ کہیں کوہ زیتون پر اس نے جو دھندلی دھندلی روشنی دیکھی تھی اسے بہت دیر تک اس کا خیال آتا رہا۔ جب وہ قیلولہ کر رہا تھا تاجر اقرونوس اس کے خیمے میں آیا اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکا سفید ریشم کا ایک تھان سر پر اٹھائے داخل ہوا اور خیام کے قدموں میں ڈال دیا۔

''ایک ناچیز تحفہ'' اقرونوس نے کہا ''اس ملاقات کی یادگار کے طور پر اگر ایک بے بضاعت تاجر عالیجاہ کی کوئی خدمت کر سکتا ہو تو.....''

حسن کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟

اقرونوس نے اپنی بھوری ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

''دیکھنے میں تو وہ کچھ دیوانہ سا نظر آتا ہے لیکن اس سے زیادہ وسیع معلومات رکھنے والا کوئی دوسرا شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ بہت سے لوگ ہیں جو اس کے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں..... میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ عالیجاہ کسی کے جویا ہیں۔ میں نے کارواں سرائے میں اڑتی ہوئی ایک خبر سنی تھی''۔

''کیا؟''

''کئی مہینے گزرے میں نے سنا تھا کہ مشہد کا ابوزید نامی ایک پارچہ فروش جس نے نیشاپور میں اپنی دوسری شادی رچائی تھی.....'' اتنا کہہ کر اس نے عمر کو تجسس کی نظر سے دیکھا۔

''پھر اس کا کیا ہوا؟''

''وہ چند روز حلب میں مقیم رہا پھر شمال کی طرف چلا گیا۔ لیکن اس واقعے کو کئی مہینے گزر رہے ہیں''۔

عمر نے ایک گہرا سانس لیا۔ آخر اسے اتنا تو معلوم ہوا کہ یاسمین حلب آئی تھی اور شاید اب کہیں اس کا پتا مل جائے۔

''تو میرے لیے وہ تحفے لایا ہے'' عمر نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''اس صلے میں اپنی طرف سے میں تجھے کیا پیش کروں''

''جی میرے لیے آپ کی نوازش ہی کافی ہے'' اقرونوس نے ذرا تامل کیا۔

''البتہ آپ ذرا حسن کا خیال رکھیں۔ وہ ہمیشہ آپ کا دوست رہے گا۔ ممکن ہے کسی وقت اسے آپ کے دامن فیض سے مستفید ہونے کی ضرورت پیش آجائے''۔

جب تاجر سلام کر کے رخصت ہو گیا تو عمر کے دماغ میں بھولی بسری یادیں ابھر آئیں۔ وہ اٹھ کر نظام الملک کے خطوط کے صندوقچے تک گیا اور اس میں سے ایک خط نکال کر غور سے پڑھنے لا' جس میں اسے ایک ملحد جماعت کے فتنے سے خبردار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وزیر مختار نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا تھا ''یہ لوگ ایک مہدی کے ظہور کی تبلیغ کرتے ہیں جو اسلام کے قوانین اور تمام موجودہ بادشاہوں کا خاتمہ کر دے گا اور وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ان کا مذہب دنیا کا ساتواں اور آخری مذہب ہے۔ وہ اس مردود کے پردوں میں پوشیدہ طور پر تبلیغ کر رہے ہیں جس نے اپنے آپ کو خراسان کا نقاب پوش مشہور کر رکھا ہے۔ جب یہ دشمنان دین اپنے قبیح جھوٹ کا پرچار کرتے ہیں تو سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ خدا ان خبیثوں کو دائمی عذاب

میں مبتلا رکھے"۔

عمر نے سفید ریشم کے تھان پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کپڑے کو نظام الملک نے تو حالت غیظ و غضب میں بھی نذر آتش کر دیا ہوتا لیکن عمر نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس کی ایک نفیس عبا تیار کرائے گا۔

مغرب کی نماز کے وقت حلب کی جامع مسجد میں حوض کے کنارے درویشوں کا ایک حلقہ۔

چھ درویش اونی کمبل اوڑھے حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک کوزہ پشت بھی چیتھڑوں میں لپٹا تھا۔ اپنی لکڑی کے سہارے جھکا ہوا کوزہ پشت اپنے قریب سے گزرنے والوں کے سامنے اپنا ٹیڑھا ہاتھ پھیلا کر خدا کے نام پر مانگ رہا تھا۔ لوگ ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنے اپنی ابھری ہوئی خورجیاں یا صندوق اٹھائے اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ نقاب پوش عورتیں ایک دوسرے کے کانوں میں چپکے چپکے اپنے سودے سلف کی باتیں کرتی ہوئی آ جا رہی تھیں۔ کمسن لڑکیاں اپنے شیر خوار بھائیوں اور بہنوں کو اپنی لچکیلی کمروں پر اٹھائے لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک مال دار عرب ایک خچر پر سوار چلا آ رہا تھا۔ خچر کے گلے کی گھنٹیاں بجتی جا رہی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں میں سکے لیے انہیں شمار کر رہا تھا۔

"میں مصیبت زدہ ہوں" کوزہ پشت نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں زور سے کہا "مصیبت زدہ پر رحم کرو، خدا کے نام پر....."

"نوحہ گر! کرائے کا رونے والا!" عرب نے بڑبڑاتے ہوئے ایک سکہ مضبوط

کشکول میں ڈال دیا اور ہوا زین میں اڑس لیا۔

''یا ہو! یا حق! رحم کرو۔ بیماروں کو اللہ کے نام پر دو''۔

''تو مسجد میں جا کر کیوں نہیں بیٹھتا'' ایک ملا بڑبڑایا۔ جس کی عبا زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی۔

میں ایک ایسی ہستی کے لیے بھیک مانگ رہا ہوں جو نان شبینہ کا محتاج ہے'' وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک عورت کوزہ پشت کے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کی بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ ''یہ لیجیے'' اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس گٹھڑی سے نکال کر کوزہ پشت کو دیتے ہوئے کہا ''یہ اس درویش کی خدمت میں حاضر ہے جو خشوع و خضوع سے آہ و زاری کرتا ہے''۔ (تمام عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ سب درویش دنیا والوں کے گناہ بخشوانے کے لیے خدا کے سامنے آہ و زاری کرتے ہیں)۔

''ہاں یہ اس کے لیے ہے جس نے خون کے آنسو بہائے ہیں'' کبڑے نے روٹی کا ٹکڑا لیتے ہوئے کہا۔

ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار بھاری نقرئی کام کا خلعت پہنے عمر خیام جو سلطان کے دربار سے واپس گزر رہا تھا ادھر سے گزرا۔

''میرے آقا!'' کوزہ پشت نے اس کی طرف دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔

جب اس نے رکاب پکڑی تو اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔

''ٹھہر جائیے میں دو سال دس ماہ سے حضور کو تلاش کر رہا ہوں''۔

اس مضطرب چہرے کی طرف جھک کر دیکھتے ہوئے عمر کو یاد آیا کہ یہ وہی شاہی

مسخرا ہے جو ایک بار چشمے کے پانی میں چاند کا عکس دیکھ کر اس کے ڈوب جانے پر رویا تھا ''جعفرک'' بے ساختہ عمر کی زبان سے نکلا۔ وہ اسکے پھٹے ہوئے کپڑوں اور سفید گدھے کی عدم موجودگی پر حیران سا ہو رہا تھا۔

''جعفرک! تیرا یہ حال ہو گیا ہے تو اب درویشوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا ہے۔ تو نے مجھے یاد کرنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''آپ کی یاد؟''

''بے شک طلائی بازو بند آپ کے مکان پر پہنچا کر..... میں..... واپس چلا آیا اور مہینوں انتظار کرتا رہا پہلے تو وہ خوب تندرست ہو گئی۔ کبھی کبھی ہنستی تھی۔ میں ضرور اسے آپ کے گھر لے آتا لیکن ایک بیوقوف مسخرا ایک حسین عورت کو ساتھ لے کر اتنا لمبا سفر کس طرح کر سکتا تھا؟ پھر ہمارے پاس ایک پیسہ بھی تو نہ تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ کیا آپ نے یاسمین کو فراموش کر دیا؟''

عمر نے اس کا دبلا پتلا بازو پکڑ لیا ''کیا وہ یہاں ہے..... اس وقت؟''

''میں اس کے لیے بھیک مانگتا ہوں جعفرک نے روٹی کا ٹکڑا دکھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ہر شام مجھ سے پوچھتی ہے کہ حاجیہ کی تشریف آوری کی کوئی اطلاع تو نہیں آئی''۔

مجھے اس کے پاس لے چل

لگام پکڑ کر جعفرک اس انبوہ میں سے گھوڑے کو نکال کر ایک گلی میں لے آیا وہ

پاؤں گھسیٹتا ہوا ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن روٹی کا ٹکڑا بدستور اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اف بیماری کے عفریت نے اسپر قبضہ کر رکھا ہے۔ اوپر کی طرف سر اٹھا کر اس نے کہا تھوڑی دیر انتظار کرنا عالیجار کو ناگوار تو نہ ہوگا؟ بس ذرا سی دیر۔ میں جا کر اسے مطلع کروں کہ اللہ نے کیا کرشمہ دکھایا ہے''۔

جب جعفرک ایک لوہار کی دکان کے برابر والے دروازے میں غائب ہو گیا تو عمر گھوڑے پر سے اتر پڑا اور گھوڑے کے شانے کی طرف جھکتے ہوئے اس نے خود بخود کہا کہ یاسمین اس سڑک کے اوپر والے کمرے میں موجود ہے۔ آخر کار جب جعفرک نیچے اتر آیا تو مسخرے نے مسکراتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرے۔

''اوہو کیا افراط و تفریط ہے۔ یا تو اتنے زمانے تک ایک معصوم فاختہ خاموش تھی یا اب یہ عالم ہے کہ پھڑ پھڑ رہی ہے۔ کپڑوں میں بسانے کے لیے عطر چاہیے۔ ہاتھوں میں رچانے کے لیے مہندی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے کے لیے پریشان ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں عالی جاہ سے عرض کر دوں کہ پہننے کے لیے اس کے پاس ریشمی کپڑے نہیں ہیں.....''

''کیا وہ مجھ سے ملنے کو تیار ہے؟ میں اوپر جا سکتا ہوں؟''

اندھیرے میں زینے میں پتھریلی سیڑھیوں پر ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتا ہوا وہ درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا چلا گیا جہاں دھندلی دھندلی شکلیں اسے غور سے دیکھ رہی تھیں حتیٰ کہ وہ چھت پر پہنچ گیا جہاں سنتروں اور گیلے کپڑوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

ایک کونے میں چھپر کے نیچے میلے کچیلے گدے پر یاسمین لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے صرف اس کی آنکھوں سے پہچان لیا۔

''میری جان آرزو'' عمر نے گھٹنوں کے بل جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میرے آقا تم کتنے شاندار نظر آرہے ہو..... ہائے میرے پاس تو ٹاٹ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا بھی نہیں کہ تمہیں اس پر بٹھا سکوں.....'' اس کا سانس پھول کر حلق میں اٹک گیا۔ حتی کہ اس نے اپنے بازو عمر کی گردن میں حمائل کر دیے عمر نے یاسمین کے رخساروں پر گرم گرم آنسو محسوس کیے۔

جب یاسمین کا دل ذرا ٹھہرا تو وہ کھسک کر عمر کے پہلو میں اور زیادہ پیوست ہوگئی اور عمر نے دیکھا کہ اسکا چہرہ ست کس قدر پیلا پڑ گیا ہے۔ صرف اس کی زلفوں کی خوشبو اور سیاہ آنکھیں جو محبت سے بھرپور ہیں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

''جب میں بیمار تھی تو میں ستاروں کو اوپر آتے اور گزرتے دیکھتی رہتی تھی''۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا ''کیوں کہ وہی ستارے تو تھے جو ''بیت النجوم'' کے اوپر نظر آتے تھے..... کیا پردے پر اژدھے کی تصویر اب بھی وہاں موجود ہے ہاں''۔

''جان جاں میں آج بھی کمرے کی ہر چیز کو تصور میں دیکھ سکتی ہوں..... کیا سب چیزیں ویسی ہی ہیں؟''

ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے اور تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

یاسمین نے پھریری لیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا ''میں بھی یہی سمجھتی تھی لیکن

میں ستاروں کے نام یاد نہیں رکھ سکی۔ بجز جوزا اور ایک دو اور ستاروں کے''۔

جعفرک نے مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے آقائے ولی نعمت سلطان کے دربار میں بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو..... تمہاری آستین پر کس قدر خوبصورت نقرئی کام بنا ہوا ہے''۔

''میں تیرے لیے خطائی ریشم کے کپڑے لاؤں گا اور زرکار پاپوش'' اور ادرک کی مٹھائی بھی''۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ''نہیں نہیں ہمیں عمدہ قسم کی ضیافت کرنی چاہیے اور اس میں پینے کے لیے شربت بھی ہوں''۔

''تیرے ہونٹوں کی شراب بھی''۔

یاسمین نے شرماتے ہوئے عمر کے رخساروں کو چھوا اور بڑی پیاری نظروں سے اس کے نفیس کمخت کے بنے ہوئے گھڑسواری کے جوتوں کو دیکھا ''کاش میں تندرست ہوتی۔ میں جب یہ سوچتی ہوں تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ تیری کنیز اپنی خوبصورتی کھو چکی ہے''۔

''میری محبوبہ! تو اب پہلے سے بھی حسین ہے''

''اس نے بے اختیار اپنی انگلیاں عمر کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ جن کو عمر نے چوم لیا لیکن اس نے توجہ بھی نہ کی ''اچھا یہ بتاؤ..... ذرا میری طرف دیکھا چپ چاپ۔ کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے اور تمہاری وہ بیوی ستاروں والے محل والے میرے کمرے میں سوتی ہے؟''

عمر نے نفی میں سر ہلایا اور وہ مطمئن ہو گئی ''میں بہت دفعہ یہ سوچ کر حیران ہو چکی

ہوں اور سنو جب میری شادی ہوئی تو میرا دماغ جل اٹھا اور میں نے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ جب..... جب ابوزید نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا میں دل برداشتہ ہوگئی اور پھر مجھے بخار آ گیا..... مجھے بند محملوں میں بٹھا کر ادھر ادھر سفر کراتے رہے۔ خدا جانے میں کہاں کہاں گئی۔ کوہستانی علاقے کی ایک سرائے میں میں نے کبڑے جعفرک کو دیکھا جس پر مجھے ترس آیا میں نے جلدی سے اسے نقشین نقرئی بازو بند دیا اور خوشامد درآمد کر کے اسے راضی کرلیا کہ وہ تمہارے پاس نیشاپور میرا پیغام لے کر جائے جہاں وہ جا رہا تھا۔ لیکن یہاں حلب میں میرا خاوند مجھ سے خفا ہو گیا اور اس نے کہا کہ اس کی توہین کی ہے۔ اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے گھر سے باہر جا کر چار گواہوں کی موجودگی میں مجھے طلاق دے دی۔ کیونکہ میں بیمار تھی بد دماغ تھی۔ اس کے بعد وہ چلا گیا.....''۔

''مجھے بازو بند یا تیرے پیغام کا کچھ علم نہیں ہے'' عمر نے اس کے کان میں چپکے سے کہا۔

''لیکن اب میں ایک مطلقہ عورت ہوں.....''

''نہیں نہیں عمر نے قہقہہ لگایا..... تم تو وہ دوشیزہ ہو جس کی اب شادی ہونے والی ہے..... میری حور! بس ایک گھنٹہ اور گزرے گا اور تو میری ہو جائے گی''۔

اس حور کے پاس نہ دولت ہے نہ حسن۔

تاہم اس تصور سے اس کا چہرہ سرخی سے دمکنے لگا اور آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ عمر کے جانے کے بعد وہ گدے پر لیٹ گئی۔ اس کے تمام جسم میں درد ہو رہا

تھا۔

نیچے سڑک پر پہنچ کر عمر نے جعفرک کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام لی۔ ''میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں'' اس نے کہا ''تاکہ میں یاسمین کو اپنے حبالہ نکاح میں لے لوں آج ہی شام تک..... تم حلوائی کی دکان پر جاؤ..... لو یہ بٹوا لو۔ مٹھائیاں اور حلوا خوان میں چن کر لے آؤ اور شربت بھی اور سرخ شراب بھی۔ محلے کے تمام لوگوں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دو اور ہاں۔ باجے والوں کو بھی لاؤ۔ اور شمع برداروں کو بھی..... چھت پر روشنی کا انتظام کرو..... خدا کے لیے اسمیں کوئی تساہل نہ ہونے پائے''۔ وہ لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور چل دیا۔ اس نے حیرت سے تکتے ہوئے چہروں اور فقیروں کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔

''مومنو'' جعفرک نے نقدی اوپر اٹھاتے ہوئے پکار کر کہا..... ''مومنو آؤ یہاں دعوت عام ہے''۔

نقاب پوش یاسمین کی موجودگی کے قوی احساس کے ساتھ عمر نے قاضی کی خشک آواز کو سنا جو اس کے قریب قالین پر بیٹھا ہوا تھا..... ''ایک کتب فروش کی دختر اور اس کا جہیز کیا طے ہوا ہے؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون کون سی املاک وہ تمہارے سپرد کرنا چاہتی ہے''۔

قاضی کی پشت پر بیٹھا ہوا کاتب شادی کی شرائط لکھتا جا رہا تھا۔

''املاک'' عمر مسکرایا۔ زلفیں اتنی سیاہ جیسے کالی آندھی' کمر اتنی خوبصورت جیسے

سرونو دمیدہ..... اور دل جو محبت کے علاوہ ہر چیز سے نا آشنا ہے۔ اس سے زیادہ اور کوئی چیز مجھے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا جلدی کیجیے۔

''لکھو قابل اعتنا قیمت کی کوئی چیز نہیں''۔ قاضی نے کاتب ہو ہدایت کی ''اور اب یہ فرمایئے عالیجاہ کہ اسے کای عنایت فرمائیں گے''۔

''ہر چیز جو میرے پاس ہے''۔

قاضی نے دست بدست عرض کیا ''کیا عالیجاہ اس امر پر توجہ فرمائیں گے کہ ہمیں معقول شراط نکاح نامہ میں درج کرنی ہیں'' ہر چیز قانون کی رو سے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہمیں تفصیل درج کرنی ہوگی یعنی کتنی زمین اور وہ کہاں واقع ہے۔ اس پر کیا عمارت بنی ہوئی ہے۔ حقوق آب پاشی' حقوق ماہی گیری اور ان کی تخمینی قیمت۔ اکے علاوہ اشیاء منقولہ کی تفصیل بھی درکار ہے یعنی کپڑے کے تھان ہیں۔ مشکل کے قطاروں کی تعداد اونٹوں کا شمار اور ان کی جائے قیام سفید باز سیاہ سیمور' دندان ماہی جن پر ہاتھی دانت کا کام کیا جس کے غلاموں کی تعداد اور ان کی قیمت کا تخمینہ.....''

''لکھو قابل اعتنا قیمت کی ہر چیز۔ عمر نے پیچھے مڑ کر کاتب کو ہدایت کی۔

قاضی نے جوش میں آ کر اپنے ہاتھ بلند کیے۔ ''بہ ریش پدر! رب کعبہ! شرائط نکاح کے سلسلے میں آج تک اس قسم کی باتیں کسی ن کاہے کو سنی ہوں گی۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی شرائط سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

پیچھے مڑ کر عمر نے طشت میں سے ایک مٹھی بھر اشرفیاں جو اس نے غلام نے وہاں

لا کر رکھی تھیں۔ ایک ایک کر کے اس نے اشرفیاں قاضی کے منہ میں رکھیں۔ اس کے بعد وہ مٹھی اشرفیاں گواہوں کی گودوں میں ڈال دیں جو اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کاتب سے ہاتھ سے نکاح نامہ لے کر اس پر گواہوں کے دستخط کرائے۔ قالین پر بیٹھے ہوئے حاضرین نے مرحبا کی صدائیں بلند کیں۔

''تیرے الفاظ سونے کی طرح قیمتی ہیں'' اس نے قاضی سے کہا جو کھانستا جا رہا تھا۔ اور ایک پالتو جانور کی طرح جوش عقیدت سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''آج سے پہلے ایسے سنہری الفاظ کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اب نکاح کی تقریب انجام پا چکی ہے۔ شادیانے بجاؤ۔ حاضرین! اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ عمر خیام نے آج کی رات ایک دوشیزہ سے نکاح کیا ہے۔''

اٹھ کر وہ چھت کی منڈیر کی طرف گیا اور جھک کر سڑک کو دیکھا جو روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ اور جہاں فقیر درویش اور محلے کے بچے جمع تھے۔ شہنائی بج رہی تھی۔ نے نواز ایک محبت کا نغمہ گا رہے تھے۔ اور شادیانوں کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی۔

''لوگو'' عمر نے چلا کر کہا ''پیٹ بھر کر کھاؤ اور جب مٹھائی ختم ہو جائے تو حلوائی کو بھی کھا جانا بتاؤ تم میں سے کون ایسا ہے جو خوش نہیں ہے''۔

''نہیں آقائے عمر ہم سب بہت خوش ہیں''۔

''کس کس کو برنج شیرینی اور شربت نہیں ملا؟''

''اللہ کی قسم کوئی بھی شخص ایسا باقی نہیں رہا''۔

''اس کے باوجود تم لوگ غریب اور مصیبت زدہ ہو آج کی رات عمر خیام سے

زیادہ مال دار کوئی نہیں ہے۔ اس کی دولت کا کوئی شمار نہیں اور نہ کوئی خیام سے زیادہ نشے میں چور ہے۔ کیونکہ اس نے آج جنت کی شراب پی ہ۔ پھر تم بھی غنی ہو جاؤ۔ طشت میں سے اشرفیاں سڑک پر الٹ دو'' اس نے اپنے تحویل دار کو حکم دیا۔

''آقا..... پورا طشت؟''

پیتل کا لمبا چوڑا طشت اس نے چھین کر عمر نے سڑک پر الٹ دیا۔ مجمع سے اطمینان اور خوشی کا شور بلند ہوا۔ بچے گرد و غبار میں اٹ گئے اور عورتیں زمین پر گھٹنے ٹیک کر چمک دار سکے چننے لگیں۔

عمر نے یاسمین کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ جس نے اپنی لرزتی ہوئی بانہیں عمر کی گردن میں حمائل کر دیں وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا سڑک پر آ گیا جہاں ایک پالکی ان کا انتظار کر رہی تھی اور بڑی احتیاط سے اس نے یاسمین کو نرم گدوں پر لٹا دیا۔ عمر نے یہ پالکی مع دو خواجہ سراؤں کے اپنے دوست عزیز سے عارضی طور پر مستعار لی تھی۔

''میری پیاری دلہن'' عمر نے یاسمین کے کان میں کہا۔

''آج سے تو ہمیشہ کے لیے میری ہے''۔

خواجہ سراؤں نے پالکی کے دروازے بند کر دیے اور لوگوں کا وہ جم غفیر جن کے ساتھ یاسمین نے غربت و افلاس کے کتنے ہی مہینے گزارے تھے۔ ایک امیر کبیر کی دلہن کے محافے سے الگ ہٹ گیا۔

''الحمدللہ'' انہوں نے یک زبان ہو کر شور مچایا تعریف ہو آقائے دانش کی جس

نے ہمیں اشرفیاں عطا کی ہیں خیام مرحبا"۔

"کوئی ہے ایسا امیر کبیر جیسا کہ باب خطا سے آنے والے عالیجاہ امیر عمر" ایک درویش نے چلا کر کہا۔

"ایک بھی نہیں" دوسرا درویش چلایا "سلامتی ہو اس پر"۔

"خدا اس کا راستہ ہمیشہ صاف رکھے"۔

ایک چھوٹی سی لڑکی گلاب کی پتیاں ایک ٹوکری میں بھرے ہوئے مجمع میں سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان پتیوں کو عمر کے گھوڑے کے سموں پر نچھاور کرنے لگی۔

"کس طرف" ایک خواجہ سرا نے عمر سے عرض کیا! کیا سلطان کا منظور نظر رہنمائی کی تکلیف گوارا کرے گا؟"

"بازار کی طرف"۔

"لیکن بازار بند ہو چکا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد سے بند ہے"۔

"اچھا" عمر نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "اب ذرا جلدی کرو"۔

لمبے تڑنگے سیاہ فام غلام پالکی اٹھائے تھے۔ خواجہ سرا نے جعفرک سے کہا کہ شاید امیر اس وقت نشے میں ہے۔

"تجھے ایسی شراب سے سرشار ہونا زندگی بھر نصیب نہ ہوگا"۔

جعفرک نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

قریبی بازار کے دروازے پر انہوں نے ایک عون باشی کو مع نصب درجن نیزہ بازوں کے تعینات پایا اسکے ہاتھ میں ایک چینی قندیل تھی۔ عون باشی نے شان

دار پالکی اور خواجہ سراؤں پر نظر ڈالتے ہوئے جو بہت عمدہ لباس پہنے ہوئے تھے عمر کو بڑے ادب کے ساتھ سلام کیا۔

''نہیں عالیجاہ'' اس نے عمر کو آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''یہ دروازہ رات کے وقت سلطان کے حکم سے بند رہتا ہے''۔

سلطان کی عنایت و نوازش سے آج کی رات میرے لیے کوئی چیز بند نہیں'' عمر مسکرایا ''لو یہ انگوٹھی بطور ثبوت اپنے پاس رکھو کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولنے کی اجازت دی تھی۔ جلدی کرو''۔

''ارے کمبخت' کیا تو شاہی منجم کو اتنی دیر منتظر رکھے گا''۔

جعفر کے نے چلا کر افسر کو کہا۔

دس سواروں نے افسر سے انگوٹھی لے لی اور مشکوک انداز میں سر ہلایا۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے پھاٹک کا ایک پٹ کھول دیا اور اپنے ماتحتوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا جیسے ہی دروازہ کھلا ایک باریش شخص جس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی چپکے سے پالکی کے پیچھے پیچھے بازار کی محراب دار چھت میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ باریش شخص بڑی تیزی سے عمر کی رکاب پکڑنے کے لیے دوڑا یا خواجہ اس نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا ''ادھر تشریف لائیے اس طرف''۔

زراق کی دکان پر ختن کا ریشمی کپڑا زبرجد کے آویزے ملاحظہ فرمائیے۔ زراق کے یہاں سونے میں جڑے ہوئے ایسے نفیس لعل اور یاقوت ہیں جیسے کسی حور کے

لبوں کی سرخی کیا امیر دانش چاندی کے جڑاؤ لاجورد خریدنا پسند فرمائیں گے اور مرمریں پیالے صدفی طشت......؟''

ایک دوسرا باریش آدمی تیزی سے آگے بڑھا۔ دوڑنے کی وجہ سے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔''اے غریبوں کے والی ادھر جانے کی تکلیف نہ فرمائیے۔ زراق کی دکان کا تمام سامان یہاں تیار ہوتا ہے بازار حلب کی پشت کی دکانوں پر...... اسے کیا معلوم زبرجد اور سنگریزے میں کیا فرق ہے۔ اس جانب زحمت فرمائیے۔ اپنے غلام شولم انطاکی کی دکان کی طرف۔ اسی ہفتے میرے یہاں زربفت کے تھان آئے ہیں۔ دمشقی زربفت کے جس پر موتی ٹکے ہوئے ہیں......''

ایک تیسرے تاجر نے جس کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔ عمر کی رکاب ہلاتے ہوئے کہا ''کافر کتو یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ گندہ دہنو تمہیں معلوم نہیں کہ عالی مرتبت امیر کو اپنی دلہن کی بلوریں گردن کے لیے قیمتی جواہرات کی ضرورت ہے؟ اس جانب آقا اپنے غلام بسطام کی دکان پر تشریف لائیے جو سچا مسلمان اور سید زادہ ہے''۔

''اے وزوان شب؟'' عمر نے چیخ کر کہا ''میں ہر چیز خریدوں گا اور اس کی قیمت سلطان بہ نفس نفیس عنایت فرمائیں گے کیونکہ آج کی رات دوبارہ آنے والی نہیں......''

رات پلک جھپکتے بیت گئی گرمی کا موسم آدھا گزر چکا تھا اور گرمی شباب پر تھی۔ عمر خیمے کے دروازے پر لیٹا یاسمین کے بالوں سے کھیل رہا تھا اور بار بار انہیں اپنی

انگلیوں میں لپیٹ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک بار پھر زندگی عود کر آئی تھی۔ رات کی سنسناہٹ اب کچھ معنی رکھتی تھی۔ گزشتہ تین سال کی طویل مدت اس سایے کی طرح معدوم ہو چکی تھی جو سمندر کی سطح سے بلند ہو کر پھر سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

ستاروں کی دودھیا روشنی میں یاسمین کا صاف شفاف بازو اس کے پہلو میں چمک رہا تھا یاسمین کے سینے پر پڑی ہوئی چادر اس کے تنفس کے ساتھ ساتھ بلند و پشت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ساج (ا) کی رچی ہوئی خوشبو خیمے کی اندرونی فضا کو مہکا رہی تھی۔

''میرے دل کی ملکہ تجھے ابھی نیند نہیں آئی'' اس نے یاسمین کے کان میں کہا۔

وہ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ آنے والے دن کی خنک ہوا خیمے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اب وہ نہ سوئے گی۔ یاسمین نے عمر کی طرف کروٹ لی 'میں بے حد خوش ہوں'' اس نے بہت نحیف آواز میں کہا ''اور اس سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے..... میں اپنی خوشی کا اندازہ لگا رہی ہوں کیوں؟ ایسا کرنے میں کوئی حرج تو نہیں''۔

''اگ ایسا کرنا غلط ہے تو میں بھی بڑا گنہگار ہوں دوزخی''۔

''ہشت'' اس نے اپنی انگلیاں خیام کے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے میری آنکھ اکثر اس وقت کھل جاتی تھی جب تارے ڈوب رہے ہوتے تھے دل تجھے یاد کر کے تڑپ اٹھتا تھا۔ میرے محبوب..... ایسے وقت اپنے دل نواز سے دور ہونا کس قدر ستم انگیز ہے۔ اور اس وقت میرا دل اس خوف سے دھک دھک کر رہا ہے

کہ خدا نے کرے تو پھر مجھ سے جدا ہو جائے''۔

''نہیں نہیں ہم دونوں نیشا پور جائیں گے۔ بیت النجوم میں۔ میں سلطان سے واپس جانے کی اجازت طلب کروں گا''۔

''ایسا کرنے کی بھلا تمہیں جرات کیسے ہو گی؟'' پھر وہ خود ہی ہنسنے لگی ''میں بھول ہی گئی تھی کہ تم ایک صاحب اقتدار شخص ہو۔ اے ہے تم میرے لیے کتنے کپڑے اور قیمتی سامان بازار سے خرید لائے ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھکارن سے ایک دم شہزادی بن گئی ہوں۔''

''تو میری زندگی ہے تین سال سے میری روح بیمار تھی''۔

''میں سمجھتی ہوں تمہاری روح بڑی مردانہ ہے''۔ وہ خاموش ہو کر پھر کچھ سوچنے لگی۔ ''کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے..... میں..... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم سے اس وقت سے محبت کرتی ہوں جب تم کتب فروشوں کی گلی میں آتے جاتے تھے اور شروع شروع میں..... نہیں مہینوں تک مجھ پر ایک پریشانی طاری رہی میرے محبوب..... مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس خیال سے مجھے خوف آتا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں کیا معلوم کہ لوگوں کا ایک ایک لفظ مجھے کس قدر اذیت پہنچاتا تھا؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے..... اور کچھ دن بعد تمہاری یاد کے سوا میں نے سب کچھ فراموش کر دیا۔ جب تم میرے ساتھ ہوتے تھے تو مجھ پر ایک جادو سا ہو جاتا تھا۔ اور جب میں تم سے الگ ہوتی تھی تو میرا تمام جسم کرب و اضطراب کی آماج گاہ بن کر رہ جاتا تھا۔

آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھی اور خیمے کی اجلی دیواریں اپنی اصلی شکل اختیار کر رہی تھیں۔

''وہ دن اب بیت گئے'' عمر نے کہا۔

وہ اس کی آنکھوں کو دیکھ سکتا تھا اور اس کی شفاف جلد کے پھیکے پن کو بھی۔ وہ سب کچھ گزر گیا بجز اس درد کے۔

''کیا؟'' عمر نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا ''تجھ اب کس بات کا رنج ہے میری جان؟ دیکھ شمشیر سحر نے رات کا سیاہ پردہ تار تار کر دیا ہے۔ اور ہم ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ اے میرے دل کی شیرینی اب کوئی غم نہ کر! یہ ہماری محبت کی سحر ہے۔ اس سے جی بھر کے لطف اٹھا۔ یہ ہماری اپنی ہے اور وہ تمام صبحیں جو اس کے بعد آئیں گے ایسی حسین نہ ہوں گی''۔

سچ کہتے ہو ایسی نہ ہوں گی''۔ وہ مسکرائی۔

''اور تمام لوگ جو ابھی تک محو خواب ہیں۔ اس بات کو کیا جانیں۔ دیکھ آفتاب کی پہلی کرن سلطان کے خیمے کو بوسہ دے رہی ہے۔ مجھے غسل کر کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہیے تا کہ ہم اس پڑاؤ سے روانہ ہو سکیں''۔

''نہیں! جان جان! ذرا توقف کرو چند لمحوں کے لیے تا کہ میں تمہارے چہرے پر دن کی روشنی کا عکس دیکھ سکوں''۔

عمر جانے کے لیے بیتاب تھا جیسے ہی ملک شاہ نے اسے نیشاپور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اس نے سفر کے لیے محافظوں کا ایک دستہ منتخب کیا۔ اور اونٹ

بار کرا دیے۔ جتنے عرصے میں اس کے غلام بوروں میں سامان بند کریں عمر نے یاسمین کے لیے ایک پردہ دار محمل ڈھونڈ نکالا جسے دو گھوڑوں پر کسا جا سکے۔ اس نے جعفرت کے لیے ایک سفید گدھا بھی خرید لیا۔

''جعفرک اب تجھے بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئے گی''۔ عمر نے ایک قہقہہ لگایا۔

مسخرے نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا حضور آپ کو ایک بات یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں آپ رستم کی طرح طاقت ور ہیں لیکن یاسمین بہت کمزور ہے۔ وہ اس خوشی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

''تو ایک دانش مند بیوقوف ہے''۔

''نہیں حضور میں تو ایک لنگڑا لولا ہوں'' جس نے درد و کرب کی چاشنی چکھی ہے وہی ایک عورت کے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہے۔

لیکن دن ڈھلے سفر پر روانہ ہوتے وقت جب بڑے بڑے امیر گھوڑوں پر سوار ہو کر عمر خیام کو کچھ دور پہنچانے آئے تو جعفرک اپنے گدھے پر چڑھ کر آگے آگے ہو لیا۔

''اے امرائے نامدار''۔ اس نے پیچھے مڑ کر زور سے کہا ''صرف ایک احمق انسان ہی شمشیر کے آگے چل سکتا ہے''۔

اس رات یاسمین کو پہلے تو سردی لگی اور اس کے بعد تیز بخار ہو گیا۔ اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا لیکن جب عمر پریشان ہونے لگا تو وہ مسکرائی۔

''اصل میں مجھ سے خوشی برداشت نہ ہو سکی۔ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی''۔

دوسری رات وہ دریائے فرات کے کنارے ٹھہرے اور تمرس کی جھاڑیوں سے گھرے ہوء ایک قطعے میں بلدن ڈھال پر اپنے خیمے نصب کیے۔ دوسرے دن صبح کو وہ ان کشتیوں پر دریا عبور کر سکتے تھے جو قافلوں کو دریا پار کرانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یاسمین کئی چادروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے رخسار تمتمائے ہوئے تھے۔ عمر جب خیمے میں کسی ضرورت سے ادھر ادھر چلتا پھرتا تو یاسمین کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں حالانکہ اسے اپنی گردن موڑنے میں تکلیف ہوتی تھی۔

''دیکھو تو سہی میں کیسی بدقسمت بیوی ہوں'' اس نے دھیمی آواز میں کہا ''میرا سرتاج میری خدمت کر رہا ہے اور میں لیٹی ہوں۔ میری شادی کے موقع پر خریدی ہوئی کچھ قیمتی اشیاء مجھے دکھاؤ''۔

اسے خوش کرنے کے لیے عمر نے پھول دار شالیں اور موتی ٹکے نقاب اور اس کی مسہری کے پاس لے گیا۔ اس نے بڑی بے خیالی سے ان پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ عمر نے ایک چاندی کی تاج نما کلاہ دکھائی جس کی پیشانی پر ایک یاقوت جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

''بہت خوبصورت ہے'' اس نے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کل میں اپنے بالوں میں کنگھی کر کے اسے پہنوں گی۔..... کچھ دن بعد ہم اپنے دریا کے کنارے ایک کوشک بنائیں گے..... نہیں بلکہ اپنا ذاتی تالاب بنوائیں گے جس میں سفید ہنس تیرتے ہوں گے؟''

اور پھر ایک لمحے کے لیے اسے سرسام ہو گیا..... بیماری نے بڑی تیزی سے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ عمر نے فوراً جعفرک کو طلب کیا جس نے دیکھتے ہی اپنا منہ پھیر لیا۔

''طاعون'' مسخرے نے زیرلب کہا۔

''نہیں طاعون نہیں ہے'' عمر نے چیخ کر کہا ''غور سے دیکھ! یہ محض بخار ہے۔ خدا سے دعا کر کہ صبح ہوتے تک اتر جائے''۔

''اب اور کر ہی کیا سکتے ہیں'' جعفرک بولا ماسوائے دعا کے''۔

رات کی سردی کم کرنے کے لیے خیمے کے چاروں طرف آگ روشن کر دی گئی جس کے عکس سے خیمے کی دیواریں سرخ نظر آ رہی تھیں یاسمین کراہ رہی تھی اور بار بار اپنا سر دھن رہی تھی۔ اسے یہ خبر بھی نہ تھی کہ عمر خیام اس پر جھکا ہوا ہے یا کوزہ پشت ایک کونے میں سکڑا ہوا اسمائے الٰہی کا ورد کر رہا ہے۔ آگ بجھ گئی اور اس کا عکس دیواروں پر ناچنا بند ہو گیا۔

جعفرک کے کانوں میں یکا یک عمر کی آواز آئی قندیل روشن کرو۔ اس نے ابھی مجھ سے کچھ کہا ہے۔ اس نے مجھے چھوا ہے۔ اس کا بخار اتر گیا ہے''۔

جب وہ قندیل لے کر ان کے پاس پہنچا اور اپنے ہاتھ کی اوٹ سے اس پر روشنی ڈالی تو یاسمین بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کیے۔ اس کا ایک ہاتھ عمر کی گردن میں حمائل تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

میری زندگی..... میری روح

پھر اس کا سر دوسری طرف ڈھلک گیا۔ اور جعفرک خاموش کھڑا اس پر روشنی ڈالتا رہا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید عمر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہ بات کچھ عجیب لیس محسوس ہوئی کیونکہ یاسمین کا تنفس بند ہو چکا تھا۔ اس نے قندیل نیچے رکھ دی اور عمر کے کندھے کو چھوا۔

قافلے والے خیمے کے چاروں طرف بجھی ہوئی آگ کے گرد بیٹھے رہے حتیٰ کہ ریگستانی ہوا کے ایک جھونکے نے دھند کا پردا چاک کر دیا اور سورج کی سرخ گیند اچھل کر نظروں کے سامنے آ گئی۔ اس دوران میں کبھی کبھی جعفرک بھی باہر آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔

''وہ ابھی تک خاموش ہے'' جعفرک نے کہا ''وہ اب بھی گلاب سے اس کی بند آنکھیں دھو رہا ہے''۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ایک سپاہی نے کہا ''اس نے طاعون سے وفات پائی''۔

''وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مر چکی ہے کیونکہ وہ اسے عروسی زیورات پہنا رہا ہے اور اس کے سینہ بند کی گھنڈیاں لگا رہا ہے۔

''بہتر ہوتا کہ وہ صدمے سے بے تاب ہو کر چیختا چلاتا۔ اپنے کپڑے پھاڑتا۔ جیسا کہ لوگ اس قسم کے ماتمی موقعوں پر کرتے ہیں''۔

''خدا کرے وہ روئے لیکن وہ روتا کیوں نہیں۔ ہے وہ زمین پر کیسی دھلی ڈھلائی لیٹی ہے۔ کتنی جوان تھی وہ..... اس کی مثال ریگستان کے اس پھول کی سی ہے جو بارش کے بعد کھلتا ہے اور جسے دوسرے ہی دن ہوا کے تیز جھونکے اڑا کر لے جاتے

ہیں"۔

لوگ بڑی بے چینی سے چل پھر رہے تھے۔ان کے لیے یہ بڑی غیر متوقع بات تھی کہ ایک ٹیلے پر ناشپاتی کے درخت کے نیچے انہیں اتنی کشادہ قبر کھودنا پڑے گی اور میت والے خیمے میں پردہ دار محمل لے جانا پڑے گا۔ جوان لڑکیاں بچے کی پیدائش پر یا کسی بیماری میں بڑی آسانی سے مر جاتی ہیں۔ یہ باب البتہ وہ ضرور جانتے تھے..... تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اور تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ وہ بڑی بے چینی سے اس کشتی کو دیکھ رہے تھے جو دریا کے کنارے کھڑی تھی۔

"غالباً" ایک شخص نے زور دے کر کہا "وہ پاگل ہو گیا ہے۔ خدا مصیبت زدوں کی حفاظت کرتا ہے"۔

"بے شمار لڑکیاں ہیں" باتونی سپاہی نے کہا "اسی نقرئی سکوں کے عوض اس وقت بغداد میں....."

"کتا" جعفر کر چیخا "اے گندی نالی میں لوٹنے والے تجھے کیا معلوم کہ محبت کی آگ میں جلنا اور تڑپنا کیا چیز ہے"۔

وہ خیمے میں داخل ہوا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آیا اور غلاموں کو حکم دیا کہ محافہ اٹھا کر پہاڑی کی چوٹی پر قبر تک لے جائیں۔

"جلدی کرو" اس نے ڈانٹ کر کہا آقا نے اسے محافے میں لٹا دیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں سے تحائف اس کے پہلو میں سجا دیے ہیں۔ آقا کا خیال ہے کہ اب اس کی محبوبہ کی رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔ سفر پر روانہ ہونے کا۔ جلدی کرو۔ وہ دیکھو وہ خود

زمین پر لیٹا ہوا ہے''۔

''ہم جنازہ اٹھانے والے تو نہیں ہیں'' اونٹوں کے نگہبان نے کہا۔

''یا خدا..... شاید وہ لاش کو کشتی پر نہ لے جانا چاہیں''۔

''نہیں نہیں قبر تک لے چلو قبر تیار ہو چکی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔

خوفزدہ غلاموں کو اپنے ساتھ لیے خیمے کے پردہ اٹھا کر جعفرک نے اندر داخل ہو کر کہا ''حضور اب ہم چلنے کو تیار ہیں۔ جب تک تمام انتظام مکمل ہو۔ آپ تھوڑی دیر یہیں قیام کریں''۔ اور سرگوشی کے انداز میں غلاموں سے کہا ''احمقو جلدی کرو اسے سب کچھ معلوم ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ آہستہ سے۔ ورنہ وہ اٹھ کھڑا ہو گا اور بولنے لگے گا''۔

خوف اور اضطراب سے کانپتے ہوئے انہوں نے بھاری محافہ اٹھایا اور خیمے سے باہر آئے اور تیزی سے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جنازہ قبر میں اتار کر انہوں نے پیروں سے اسے مٹی اور خس وخاشاک سے بھر دیا۔ اوپر سے پتھر چن کر قبر کی ظاہری شکل مکمل کر دی۔ اس کے بعد وہ بھاگتے ہوئے نیچے اترے اور خیمے کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اونٹوں پر سامان بار کیا جانے لگا۔ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی زینیں کس لیں۔

حضور جعفرک نے چلا کر کہا ''ہم تیار ہیں اب وقت آ گیا ہے''۔

عمر جب خیمے سے باہر آیا تو اس نے اپنی دستار کے کونے سے اپنے ہونٹ چھپا رکھے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اڑتی ہوئی خاک اور اداس اور سنسان دریا کی طرف

ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتظار کرتے ہوئے آدمیوں کی طرف جو ایک جگہ جمع تھے دیکھ کر حکم دیا۔ ''اس خیمے کو آگ لگا دو اور روفان ہو جاؤ' اور یہ سب سامان جو تمہارے پاس ہے وہ بھی لے جاؤ۔ میں تمہارے چہرے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ خبردار تم میں سے کسی کی منحوس صورت اب مجھے نظر نہ آئے''۔

آقا! جعفرک نے احتجاج کیا۔

''آپ بھی چلیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں طاعون ہے''۔

کشتی نے دریا پار کر لیا اور جانور اور دریا کے دوسرے کنارے پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ عمر خیمے کی سیاہ راکھ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو غور سے دیکھتا رہا۔ بل کھاتے ہوئے دھوئیں کی آمیزش سے اڑتی ہوئی دھول بھی سیاہ نظر آ رہی تھی۔ حتی کہ سورج کی سرخ گیند بھی ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جیسے آسمان پر قندیل لٹک رہی ہو۔

وہ قندیل اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اور تمام آسمان بیرقوں سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خاکستری زمین خالی خالی نظر آ رہی تھی۔ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی خلا ہی خلا تھا۔ کارواں کے تمام آچار معدوم ہو چکے تھے اور وہ آگ جس نے خیمے کو بھسم کر دیا تھا اب اس کے دل میں بھڑک اٹھی تھی۔ جلا رہی تھی۔ جلا رہی تھی۔ اس کے تمام جسم کو.....

''حضور''، جعفرک کی آواز اس کے کانوں میں گونجی ''وہ دریا ہے موت کا پیش خیمہ''۔

پانی طغیانی کی وجہ سے اس کے قدموں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے پھسل پھسل کر اس میں گر رہے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔ جعفرک نے اپنا بازو عمر کے کندھے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کے اس طوفان کو دیکھنے کے لیے زمین پر بیٹھ گیا جو اس کے اتنے قریب سے گزر رہا تھا۔

ٹن ٹن ٹن اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ایک زنجیر کھڑکھڑائی اور ایک نئے کارواں کی قطار دریا کے اس پار انتظار کے لیے رک گئی۔ کشتی ایک بار پھر دریا عبور کر کے واپس آ گئی۔ اجنبی لوگ اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے جانے لگے۔

''نہیں یہ طاعون نہیں ہے'' جعفرک کی آواز بلند ہوئی ''اسے بخار بالکل نہیں ہے وہ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ کہ اسے اتنی اذیت پہنچے گی..... خداوندا اسے کیا دیا جائے؟ کیا تیرے پاس آنسوؤں کا تحفہ بھی نہیں؟''

ایک شخص نے آگے بڑھ کر کچھ کہا۔ ایک بڑا جام عمر کے ہاتھ سے مس ہوا اور اس نے جام پر نظر ڈالی وہ سرخ شراب سے بھرا ہوا تھا۔

دریا کا پانی۔ اقرونوس تاجر کی آواز آئی۔ پینے کے لیے مناسب نہیں۔ آپ یہ پیجیے۔

اقرونوس نے جام عمر کے ہونٹوں سے لگا دیا اس نے ایک گھونٹ پیا۔ جب جام خالی ہو گیا تو اقرونو نے اسے دوبارہ بھر دیا۔ شراب میں مسالے کی آمیزش تھی جس نے اس کے دماغ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو قدرے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ پیتا رہا حتی کہ

آسمان پر سیاہ پردے لہرانے لگے اور سورج کی قندیل ان کے پیچھے غائب ہوگئی۔

خراسان کی سڑک.....کردوں کی پہاڑیوں پر سیاہ پتھروں کا درہ

اس کے کانوں میں اونٹوں کی گھنٹیاں بجنے کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ لمبے لمبے موٹے بالوں والا ایک خچر عمر کو اپنی پیٹھ پر لادے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل رہا تھا عمر غنودگی کے عالم میں زین پر بیٹھا ادھر ادھر ہل رہا تھا۔ کیونکہ زین کی تپش ایک جیتی جاگتی چیز کی طرح اس سے ملنے کے لیے اوپر آرہی تھی۔

رات کے وقت جب اسے نیند نہ آئی تو اس نے اقرونوس کی دی ہوئی شراب کے کئی جام پیے اور جانوروں کے رکھوالوں سے باتیں کرتا رہا۔ وہ لوگ اسے پاگل سمجھ کر بڑے شریفانہ انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیتے رہے جب باتیں کرنے میں بھی اسے سکون میسر نہ ہوا اور بہت دور دریا کے قریب کنارے قبر میں لیٹی ہوئی نقاب پوش یاسمین کے تصور نے اس کے دماغ میں ابھر کر اس کے جسم میں ایک دفعہ پھر آگ بھڑکا دی تو اس نے شراب کی صراحی طلب کی اور اس وقت تک تھوڑی تھوڑی پیتا رہا جب تک ستارے چلتے چلتے آسمان کے دوسرے کنارے پر نہ جا پہنچے۔

''وہ بہت کمزور ہوگیا ہے'' جعفر ک نے اقرونوس سے کہا۔

''پیاسا رہنے کے مقابلے میں'' اقرونوس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''پیتے رہنا بہتر ہے''۔

''لیکن کل کیا ہوگا اور کل کے بعد آنے والی کل؟''

''جب کل ہوگی دیکھا جائے گا''۔

یہ سن کر عمر اپنے گدے پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ان کی طرف دیکھا ''اگر یہ گزری ہوئی کل اور آنے والی کل کا چکر نہ ہوتا تو زندہ رہنا کس قدر آسان ہو جاتا'' وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا ''اگر ہم ماضی کے چہرے پر نسیاں کی نقاب ڈال دیں اور اگ رہم مستقبل کے پردے کو کبھی نہ سرکائیں اور اگر ''آج'' کسی اور چیز سے کبھی نہ بدل سکے ''سلامتی'' جعفر کے زیر لب بڑبڑایا۔ ''خدا تجھے سلامت رکھے'' وہ ریگستان کی سطح سے کوہستان کر دپر چڑھ رہے تھے۔ اس قدیم سڑک پر جو زائرین کی آمد و رفت کی کثرت سے چکنی ہو گئی تھی ایک روز تیسرے پہر کے بعد کارواں کے تمام تاجر پتھروں کے اس ڈھیر کے قریب رک گئے۔ ان پتھروں کا رنگ بھورا تھا اور جسامت میں نصف انسانی کے برابر تھے۔

ان میں سے کچھ پتھروں پر انسانی چہروں کے آثار پائے جاتے تھے اور لڑھکنے کی وجہ سے تمام پتھروں کے کنارے گھسے ہوئے تھے۔ کارواں کے سب تاجر سواریوں سے اتر کر ان پتھروں کے قریب گئے دھکیل اور کھینچ کر انہوں نے ان پتھروں کو سڑک پر کچھ دور لے جا کر چھوڑ دیا۔

''اخاہ'' اقرونوس نے کہا ''وہ ان پتھروں کو مکے کی سمت میں جانے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ سیاح پتھر پہاڑوں سے روانہ ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان ان کے سفر میں ان کی مدد کرتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں کم عمر تھا تو یہ پتھر قصر شیریں کے بازار میں

پڑے تھے۔"

جعفر ک ان بڑے پتھروں کی زیارت کرنے کو گیا۔ وہ بالکل معمولی پتھر تھے۔ لیکن انہیں سڑک پر آرام سے پڑے دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ ان تھروں کو بغداد پہنچنے میں کتنا عرصہ لگے گا اور آیا یہ کبھی ریگستان عبور کر کے ملہ معظمہ تک پہنچ بھی سکیں گے لیکن تاجر اس شام مسلسل بلند آواز عبادت کرتے رہے۔ جو لوگ حج کی سعادت حاصل کر چکے تھے وہ قزاقوں کے پیش نقبضوں اور تیروں سے محفوظ رہنے کے لیے بار بار اپنے تعویذ نمایاں کرتے تھے۔

کیونکہ اس پہاڑیوں میں کرد اپنے پڑاؤ سے نیچے اتر کر اونٹوں کی قطاروں پر حملہ کیا کرتے تھے۔

جب رات بحفاظت تمام گزر گئی تو صبح کے وقت تاجروں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک بار پھر سیاح پتھروں کو تھوڑی دور اور آگے دھکیلا۔ اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ جس شخص کے پاس شراب ہو وہ اس روز کارواں سے پیچھے رہ جائے۔

"وہ ہماری بصارت اور سماعت سے دور رہ کر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہمراہی ہمارے لیے منحوس ہے اور ہم پر مصیبت نازل کر سکتی ہے۔ وہ ہمارے کارواں کے غبارے کے پیچھے پیچھے آ سکتا ہے۔"

اپنے اس جوش و خروش پر انہوں نے اقرونوس کو ڈھونڈ نکالا اور کہا کہ "تو یونانی اور کافر ہے۔ تو بھی شراب فروش کے ہمراہ پیچھے قیام کر۔"

"آج سڑک پر خطر ہے" بھورے بالوں والے اقرونوس نے احتجاج کیا" اور

کارواں سے علیحدہ ہو کر دو آدمیوں پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں صرف ان کے گھوڑوں کی وجہ سے ہی موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں میں یونانی نہیں ارمنی ہوں"۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ واللہ تجھے شرم نہیں آتی..... خنزیر کا گوشت کھانے والے؟ تیری وجہ سے ہم اپنے اوپر مصیبت نازل کرالیں؟"

اقرونوس خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا..... کیونکہ بغداد کے سوداگر مسلح تھے اور ان کے ساتھ حفاظتی سواروں کا دستہ بھی تھا۔ جب وہ سوار ہو گئے اور اونٹوں کی قطاریں سڑک کے اوپر چل پڑیں تو عمر اپنے خچر کے پاس ایک سیاہ پتھر پر بیٹھا رہا۔

"خواجہ عمر! چلیے" انہوں نے آواز دے کر کہا۔

"نہیں تم بغیر شراب کے چلے جاؤ میں نہیں جاؤں گا۔"

یہ بڑی نادانی ہے۔ جعفرک نے لقمہ دیا "کہ ہم پیچھے رہ جائیں یہ مقام بیوقوفوں کے لیے ہے۔ اج حج بیت اللہ سے سرفراز ہو چکے ہیں سوار ہو جائیے!"

شراب فروش جو ایک دبلا پتلا آدمی تھا اور بے حد شکایتیں کرتا تھا جب کارواں روانہ ہو گیا تو کوئی احتجاج نہ کیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس وقت تک انتظار کرنے کا حکم دیا جب تک کارواں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ "جو کچھ آج ہونا ہے تقدیر میں لکھا جا چکا ہے" اسنے بڑی بے دلی سے کہا "اور جو تقدیر کا لکھا ہے وہ پیش آ کر رہے گا۔ میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ میں ایک احمق ایک شرابی اور ایک ارمنی کا ساتھ سفر کروں"۔

جب کارواں آخری حصہ بھی درے کے دہانے پر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شراب فروش نے اپنے اونٹ کھڑے کیے اور اس کے ملازموں نے اپنے اپنے اسلحے اٹھا لیے۔ جعفرک بھی اپنے گدھے پر سوار ہو گیا۔ تیز دھوپ میں وہ آہستہ آہستہ درے کی طرف بڑھنے لگے۔

جب وہ قلعہ کوہ سے چکر کاٹ کر ڈھلان کی طرف اتر رہے تھے ساربانوں نے اپنے جانوروں کو روک لیا۔ سنو انہوں نے چلا کر کہا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے تمام گھاٹی گونج اٹھی۔ دور کہیں آدمیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں اور شراب کے تاجر نے چلا کر کہا کہ بس اب کردآیا ہی چاہتے ہیں اور ہم سب قتل کر دیے جائیں گے۔

''ہمیں اپنے جانور چھپا دینے چاہئیں'' اقرونوس نے مشورہ دیا ''ہم بھاگ کر جان نہیں بچا سکتے''۔

''کوئی شخص'' تاجر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''اپنی قسمت کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا''۔

خوف سے کانپتے ہوئے ساربانوں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو تنگ گھاٹی میں ایک خشک دریا کے چڑھاؤ کی جانب ہانک کر چھپا دیا۔ گھڑسواروں نے تمرس کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لی۔

اوپر کی طرف افق پر انہوں نے کچھ گھڑسواروں کو دیکھا جو نیزے ہلاتے سرپٹ چلے جا رہے تھے قریب ہی چیخ و پکار کنکریوں کے بجنے اور پتھروں کے لڑھکنے کی ملی

جلی آوازیں سنائی دیں۔

بلاشبہ جعفرک نے زیرلب کہا انہی پہاڑیوں نے ان لوگوں کو جنم دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا محاصرہ کرلیا ہے اولوٹ کے مال کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں۔ اقرونوس نے اپنے شانوں کو جھٹکا دیا اور اس وقت تک سکون سے انتظار کرتا رہا جب تک خاموشی طاری نہ ہوگئی۔

انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا مسخرے نے چلا کر کہا۔

جب ایک گھنٹے تک ہر طرف سناٹا چھایا رہا تو تاجر نے آگے بڑھنے کی حامی بھری بظاہر کردجا چکے تھے۔

لیکن پہلے ہی موڑ پر حیرت زدہ ہو کر انہوں نے اپنی باگیں روک لیں۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی جگہ پر کارواں پسماندہ پڑا تھا۔ رسیاں تھیلے پھٹے ہوئے بورے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے سوائے ایک لنگڑے گدھے اور چند کتوں کے بغداد ک تاجروں کے تماما جانور مع مالکوں کے غائب تھے۔ چند رسابان پریشان حال ٹوٹے پھوٹے سامان کے نیچے ادھر ادھر دبے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

کسی قسم کے ہتھیار کا پتا نہ تھا اور مسلح نگہبان جیسے ہوا میں تحلی ہو گئے تھے۔

اقرونوس نے جو پہاڑی قبیلوں کے اس سے زیادہ حملے دیکھ چکا تھا بڑی آزردگی کے انداز سے سر ہلایا ''افسوس'' اسنے کہا ''کردوں نے ہمارے بغدادی بھائیوں پر حملہ کر دیا ہے اور کارواں کو اس پرندے کی طرح پکڑ کر لے گئے ہیں جو اپنے نچے

ہوئے پر پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ غالباً ہمارے کچھ دوست تو اپنے گھوڑوں کی برق رفتاری کے سہارے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن باقی یرغمال کے طور پر کام آ گئے ہیں۔ ہم نے انہیں لے جاتے ہوئے کردوں ہی کی آواز سنی تھی۔ افسوس ان کے محافظ ان کی حفاظت نہ کر سکے..... وہ اب کردوں کے غلام ہیں۔"

ایسے ہی ایک حملے میں اس کے کپڑوں کی ایک گانٹھ تو ضرور شائع ہو گئی تھی لیکن وہ خود بچ نکلا تھا۔

لیکن عمر ہنسا "ہماری شراب محفوظ ہے۔ جس قیمت کا مال ہمارے پاس ہے اس کے مقابلے میں ان تاجروں کا آدھا بھی نقصان نہیں ہوا۔ لٹے ہوئے کارواں کے بچے کھچے آدمیوں اور پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے ساتھ وہ لوگ تیزی سے میدان کی اوپر کی سمت سفر کرنے لگے۔ کردوں کے خوف نے ان کی رفتار بھی تیز کر دی اور رات کو وہ پڑاؤ کرنے کے لیے بھی کسی جگہ نہ رکے۔ تھکے ہوئے بوڑھے چاند کے سایے میں وہ پہاڑوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھتے رہے اور جعفر کے نے اقرونوس سے کہا کہ یہ لوگ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے مردے اپنی قبریں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔

"پھر بھی اہواد رویرانے میں خیام خوش نظر آتا ہے"۔

اچھا مجھے ایک بات بتا ارمنی نے جواب میں پوچھا تو نے کہا تھا کہ تین سال ہوئے تو اس لڑکی یاسمین کا پیغام لے کر گیا تھا۔ لیکن عمر کا بیان ہے کہ اسے اس لڑکی کے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی حتی کہ اس نے تجھے حلب کے درویشوں کے درمیان

دیکھا''

خدا گواہ ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ میں نے اسے بیت النجوم میں تلاش کیا۔ وہ وہاں نہ تھا آخر میں ایک نشانی اور پیغام وہاں چھوڑ آیا تھا''۔

''لیکن ظاہر ہے اسے کوئی پیغام نہیں ملا آخر ایسا کیوں ہوا؟ چل خیال سچ سچ بیان کر''۔

''نہیں ابھی نہیں وہ اس لڑکی کی یاد میں مغموم ہے مجھے ڈر لگتا ہے''۔

''کس بات سے ڈر لگتا ہے؟ چل آگے بڑھ!'' اقرونوس نے اپنے خچر کو ایڑ لگائی اور مسخرے کے گدھے کی لگام میں پکڑ کر کھینچتا ہوا عمر کے قریب لے آیا ''جعفرک کہتا ہے'' اقرونوس نے عمر سے کہا ''تین سال ہوئے وہ یاسمین کا ایک پیغام لے کر تمہارے گھر آیا تھا اور ایک نشانی بھی وہاں چھوڑ گیا تھا لیکن تم اس واقعے کو بھول گئے ہو؟''

عمر نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے حیرت ہے حضور'' جعفرک نے چیخ کر عمر سے کہا ''آپ نے اتنے طویل عرصے تک نہ تو اسے اپنے پاس بلایا اور نہ تلاش کیا''

''وہ کیا نشانی تھی؟ کیا پیغام تھا؟''

''ایک نقرئی جڑاؤ بازو بند اور یہ پیغام کہ یاسمین بیمار ہے اور وہ مغرب کی سمت حلب جا رہی ہے''۔

وہ دن عمر کو اچھی طرح یاد تھا جب اس نے یاسمین کے بازو پر وہ بازو بند باندھا

تھا۔'' مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں ہے تو نے کس سے گفتگو کی تھی..... ملازم سے؟ یا خواجہ میمون سے؟''

جعفرک نے اپنی گردن ہلائی ''وہ چھوٹے قد کا ایک مضبوط آدمی تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی جب وہ بولتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ یاسمین کیا واقعی سخت بیمار ہے؟ میں نے اس سے کہا تھا خداوند کریم یاسمین کی حالت پر رحم فرمائے''۔

''بس خاموش'' عمر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا وہ تو توش تھا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا سفید جھوٹ''۔

جب عمر کچھ دیر تک خاموش رہا تو جعفرک پیچھے ہٹ گیا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کی گفتگو عمر کے کانوں تک نہ پہنچ سکے گی وہ ارمنی تاجر سے مخاطب ہوا۔

اس بات کا کیا مقصد تھا؟ تجھے اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اب اس کی کیفیت دیوانوں کی سی ہے''۔

''اس بات کی قیمت میرے لیے اتنی ہے جتنی کپڑے کے لدے ہوئے کئی اونٹوں کی''۔

اقرونوس مسکرایا لیکن وہ اپنا مافی الضمیر الفاظ میں ادا نہ کر سکا۔ اور جعفرک کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر سوچتا رہا کہ آخر نظام الملک کے جاسوسوں کے سربراہ توتوش نے عمر کو لڑوانے میں اقرونوس کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

دریائے نیشاپور کے کنارے بیت النجوم

خواجہ میمون ان نجیب الواسطی اپنے دونوں ہاتھ آستینوں میں لپیٹے دیوان خانے میں خاموش بیٹھا تھا۔ پہلو میں رصد گاہ کا مظفر الافزاری تھا۔ ان کے چھ مددگار دیوار سے پشت لگائے بیٹھے تھے یہ لوگ ایک سال تک مسلسل کام کرتے رہے تھے۔

ان کے سامنے چوکیوں پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے جن پر اعداد و شمار کی بے شمار جدولیں بنی ہوئی تھیں۔ خواجہ میمون اپنی خشک آواز میں بیان کر رہا تھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ لیکن داخل کوتاہیوں کا احساس بھی پریشان کر رہا تھا۔ سلطان کا نوجوان منجم جو حال ہی سے مغرب کے سفر سے واپس آیا تھا مسند پر ہاتھ پھیلائے سیدھا لیٹا ہوا تھا جیسے اس پر نشے کی کیفیت طاری ہو۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور دھیمے سروں میں زیر لب کچھ گنگنا رہا تھا۔

اس کے علاوہ عمر کی پشت پر سیاہ ٹوپی اور الجھی ہوئی بھوری ڈاڑھی والا کوزہ پشت مسخرا دیوار پر جھکا بیٹھا تھا۔ خواجہ میمون کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان ریاض دانوں کے سامنے اس کے وقار کو دھچکا لگا ہے۔ سائنس دانوں کا دربان ایک مسخرا بڑی عجیب سی بات تھی۔

اس نے تفصیلی روئیداد کو مختصر کرتے ہوئے سرد مہری کے لہجے میں کہا "موسم بہار میں ۲۰ مارچ کو نقطہ اعتدال پر طلوع آفتاب کے وقت اور ہمارے مقررہ وقت میں تین گھنٹے نو منٹ کا فرق رہا۔

"تین گھنٹے" عمر نے دہرایا "اور نو منٹ"

میمون نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔عمر کی عدم موجودگی میں اس نے پوشیدہ طور پر اس بات کی انتہائی کوشش کی تھی کہ سورج کے طلوع وغروب کے اوقات کا زیادہ سے زیادہ صحیح تعین کر سکے تا کہ وہ اس تخمینے کی داد وتحسین کا حق دار گردانا جائے۔

ایک ہتھوڑا لے کر عمر نے کہا ''اس پن گھڑی کو توڑ ڈالو''۔

نہیں نہیں حالی جاہ اسغر اری نے بات بنائی جس کے ذمے پن گھڑی کا حساب رکھنا تھا۔سورج کے اوقات اور پن گھڑی کے اوقات میں سترہ منٹ سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ممکن ہے اس سے قدرے زیادہ ہو لیکن.....''

یا خدا عمر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے چلا کر کہا گھڑی اس قدر صحیح ہے؟

انشاءاللہ

''اور اس کے باوجود تم لوگ ایک سال کے عرصے میں سورج سے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کے فرق پر ہو۔

''یہ ہماری بدقسمتی ہے.....''

''تم سب دفان ہو جاؤ ان آلات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بازار سے لونڈے اور وقت کا شمار کرنے کے لیے اصفہان کی رقص کرنے والی نازک اندام لڑکیاں لے کر آؤ.....تم کس منہ سے اپنے آپ کو ریاضی کا ماہر کہتے ہو۔جاؤ مدرسوں میں جا کر لونڈے پڑھاؤ''۔

تمام مددگارہ اسغر اری کے ساتھ دیوان خانے سے باہر نکل گئے۔صرف بوڑھا میمون بے حس وحرکت وہاں بیٹھا رہا۔

حضور جعفرک نے بڑی لجاجت سے کہا ''چھ گھنٹے تو یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ میں تو اکثر تربوز کھا کر کبھی کبھی غنودگی کے عالم میں اتنا وقت گزار دیتا ہوں اور اس کا خیال بھی نہیں کرتا''۔

''تو پھر تجھے بھی منجم ہونا چاہیے'' عمر نے تالی بجاتے ہوئے کہا ''شراب لے کر آ..... شیراز کی سرخ شراب، سربمہر صراحی میں سے''۔

جب خوفزدہ غلام نے شراب سے ساغر بھر دیا تو عمر آہستہ آہستہ پینے لگا۔ میمون کو یوں محسوس ہوا جیسے خیام کے جس میں شیطان حلول کر گیا ہے۔ لیکن وہ طے کیے بیٹھا تھا کہ جب تک وہ خود کو حق بجانب ثابت نہ کر لے گا۔ وہاں سے نہ ٹلے گا۔ اقرونوس بڑے پر اثر انداز سے دیکھ رہا تھا عمر نے ایک گہرا سانس لیا اور ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر دیکھا۔

''یہ جدول کس نے بنائی ہے؟''

''عالی جاہ!'' میمون نے سنجیدگی سے کہا ''میں نے خود ان کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اس میں آپ کو کوئی غلطی نہ ملے گی''۔

عمر نے جدول کے ہندسوں پر ایک نظر ڈالی اور کاغذ کا ایک قطعہ اور اٹھا لیا۔ اس کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کیا ''تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ تیرے تخمینے بالکل صحیح ہیں۔ اور اسغزاری بھی قسمیہ بیان کرتا ہے کہ پن گھڑی غلط نہیں ہے۔ تم میں سے ایک شخص ضرور غلطی پر ہے..... لیکن کون؟''

''جہاں تک گھڑی کا تعلق ہے۔ وہ ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ہاں ایک مہینے کے

بعد اس کا فرق معلوم ہوا تھا'' میمون نے سرکشی کے انداز میں اپنا سر اوپر کیا'' چیخ کر یہ کہنا بہت آسان ہے کہ دفان ہو جاؤ۔ لیکن میں کعبے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے بذات خود ان نتائج کی صحت کا یقین کر لیا ہے''۔

''بطلیموس کی جدول نجوم کے ذریعے؟''

''جی ہاں یقیناً''۔

''نیشاپور کے عرض البلد کا تعین کر کے؟ بطلیموس نے اپنے مشاہدات اسکندریہ میں بیٹھ کر کیے تھے''۔

''مجھے تو اس کا یقین ہے۔ کیا عالی جاہ خود اس کی تصدیق فرمانا گوارا کریں گے؟ گزشتہ ماہ کی یہ جدول حاضر ہے''۔

عمر نے قلم اٹھا کر اک مختصر سا حساب لگایا اور میمون کے اعداد و شمار سے اس کا مقابلہ کیا اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' عرض البلد کا تعین بھی صحیح ہوا ہے۔ ستاروں میں بھی کوئی فرق نہیں۔ گھڑی بھی درست ہے۔ اسکے باوجود چھ گھنٹے کا فرق آتا ہے۔ بغداد کے علامہ! تیرے پاس اس کا کیا جواب ہے؟''

میمون نے آہستگی سے سر ہلایا'' یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے''۔

''بطلیموس کی جدول لے کر آؤ''

جب وہ عظیم مخطوط اس کے سامنے پیش کیا گیا تو عمر نے میمون کی یادداشتوں کا پہلا صفحہ اٹھایا اور سر جھکا کر حساب لگانے میں محسوس ہو گیا۔ اقرونوس اٹھ کر اپنے بستر

میں جالیٹا اور جعفر ک ایک غالیچے پر سکڑ کر سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن میمون الو کی طرح ٹکٹکی باندھے خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب چراغ کی لو سے شعلہ سا بھڑک کر بجھ گیا تو میمون نے اٹھ کر چراغ میں تھوڑا سا تیل ڈال دیا۔

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا'' عمر نے بے خیالی میں کہا اور نیا صفحہ اٹھالیا اور جب روشن دانوں سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی اور چراغ کی لو مدھم پڑ گئی تو عمر بھی کام کے اختتام تک پہنچ گیا۔ اور میمون دم بخود کوئی بات سننے کا انتظار کرنے لگا۔

''میرے اعداد و شمار بالکل صحیح ہیں'' وہ بڑبڑایا۔

چند لمحے عمر نے بطلیموس کے مخطوطے کے پہلے اور آخری صفحے کا بغور مطالعہ کیا۔

''تیرے تخمینے بالکل صحیح ہیں'' عمر نے زیر لب کہا ''اور اسی لیے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق مسلسل چلا آ رہا ہے۔ تیرا پہلا اندراج یہ ہے۔ اور ایسا ہی آخری اندراج ہے۔ اور دونوں میں سورج کے وقت سے چھ گھنٹے اٹھارہ منٹ کا فرق ہے''۔

''میمون نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس کی تصدیق کی 'یہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ غلطی یہاں ہے'' عمر نے بطلیموس کے بوسیدہ مخطوط پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خدا معاف کرے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ غلطی..... صدیاں گزر جانے کے بعد.....'' فرط حیرت سے میمون کا حلق خشک ہو گیا۔

''ایک مستقل غلطی ہاں''۔

''لیکن کیوں کر؟..... اتنا بڑا اشاہد..... اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا؟''

''کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اسے کسی طرح درست کیا جائے'' عمر مسکرایا اس کی

تھکی ہوئی آنکھوں سے تفکر کے آثار نمایاں تھے..... ''لیکن اسکندریہ کے اس عظیم شخص کو قبر میں سوئے ہوئے زمانہ گزر گیا''۔

بوڑھے آدمی کے چہرے پر بطلیموس سے بے اعتقادی کے آثار پیدا ہوئے کیونکہ اس کی جدول نجوم صدیوں سے مسلمان سائنس داں استعمال کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نیشاپور کی جامع مسجد کے میناروں کے گرتا ہوا دیکھ سکتا تھا لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی آسکتی تھی کہ بطلیموس غلطی کر سکتا ہے۔

''ہے ہے'' اس نے دردانگیز لہجے میں کہا اور اس غلطی کی دریافت کا پورا تاثر اس پر حاوی ہو گیا۔ ''تو پھر ہماری ساری محنت اکارت گئی خرمی کی بھی۔ اور دوسرے تمام لوگوں کی بھی..... قائم ستاروں کی تمام جدولیں غلط ہو گئیں۔ بالکل غلط' بہت دل برداشتہ ہو کر اس نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اگر کمرہ کا فرش کناروں سے بلند ہو گیا ہوتا تو اسے اس قدر تعجب نہ ہوتا لیکن عمر کی سیاہ آنکھیں ساکت تھیں۔

''ٹھہرو! میمون ذرا ٹھہرو۔ غلطی بہت معمولی ہے۔ لیکن متواتر اور مستقل''۔ یہ یہاں سے پہلے خانے میں اور آخری میں بھی۔ یہ مشاہدات بالکل صحیح کیے گئے تھے۔ مگر غلط بھی۔ قدرے غلط'' وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے کمرے کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خیرہ کار آفتاب کو تکنے لگا'' صحیح اور غلط..... ایسا ہونا ناممکن نہیں لیکن ہے کاش ہم اس پردہ راز کو چاک کر سکتے''۔

میمون نے اس کے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔ ''غیب کا حال تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ پوشیدہ رازوں کی کنجیاں تو صرف اسی کے قبضے میں ہیں''۔

''اگر وہ کنجی ہمیں حاصل ہو جائے..... وہ کنجی' عمر اک دم مڑا ''اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ کی بطلیموس کے عرض البلد اور طول البلد صحیح ہیں''؟

''ارے اس میں کیا شک ہے..... کیا ہم نے گزشتہ تین نسلوں سے ان کو تسلیم نہیں کیا ہے''۔

تو پھر ٹھہرے ہوئے ستارو کی جدول کی کنجی ضرور اس کے پاس ہو گی۔ صرف وہی ان جدولوں کو استعمال کر سکتا تھا لیکن اگر دوسرے لوگ..... جن کے پاس وہ کنجی نہیں ہے..... انہیں استعمال کریں گے تو اپنے حساب میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم ناکام ہو گئے ہیں'' اس نے کھلے ہوئے مخطوطے پر اپنا ہاتھ مارا ''کنجی کی مدد سے ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں میمون..... صرف ہم''۔

''سچ اور جھوٹ مین اگر بال برابر کا بھی فرق ہے تو جھوٹ کبھی سچ نہیں ہو سکتا''۔

عمر نے سائنس دان کو غور سے دیکھا اور اس کا چہرہ اتر گیا ''میمون بوڑھے استاد! مجھے معاف کرنا۔ میں ناحق تم پر ناراض ہوا۔ تم نے مجھے کنجی عطا کر دی ہے جس سے جھوٹ سچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں''

''یا اللہ یہ بات کوئی نہیں جان سکتا''۔

''یہ بہت چھوٹی سی کنجی ہے۔ تم نے اس جدول کی مدد سے نیشاپور کے عرض البلد کا تعین کیوں کیا؟''

اس لیے کہ..... منجم کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا..... ''ٹھہرے ہوئے ستارے

اسکندریہ کے مقابلے میں جہاں بطلیموس نے مشاہدہ کیا تھا۔ نیشاپور سے مختلف زاویے سے نظر آتے ہیں''۔

''اور فرض کرو'' عمر نے سوال کیا ''اگر وہ اسکندریہ سے نظر ہی نہ آتے ہوں''۔

''یا اللہ کیا بطلیموس کی رصد گاہ اسکندریہ میں نہ تھی؟''

''جی ہاں اور ہم نے یہیں سے دھوکا کھایا ہے''۔

میمون نے تھکے ہوئے انداز سے عمر کو دیکھا..... بالکل خالی الذہن ہو کر ''پاگل ہو گیا ہے'' وہ بڑبڑایا۔

''نہیں بطلیموس نے یہ جدولیں اسکندریہ میں بیٹھ کر نہیں بنائیں۔ وہ کسی اور نے ترتیب دی ہیں اس کے عہد سے بھی قبل۔ کسی اور مقام پر۔ اس نے بھی انہیں اسی طرح استعمال کیا جیسے ہم کر رہے ہیں..... اس نے انہیں اپنا سمجھ کر استعمال کیا لیکن نجوم کے اس ماہر کو وہ جانتا تھا جس نے یہ جدولیں مرتب کی تھیں۔ وہ یقیناً جانتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کے تمام تخمینے تمام پیشن گوئیاں صحیح تھیں''۔

خواجہ میمون کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ یکا یک پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں اس پر حقیقت روشن ہو گئی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے عمر کیس فوق الفطرت طاقت کا مالک ہے جس کے ذریعے اس نے اس راز کو بے نقاب کر دیا ہے جو نو صدیوں سے پوشیدہ تھا۔ نظام الملک نے واقع سچ کہا تھا کہ عمر عجیب و غریب قوتوں کا حامل ہے؟''

''یقیناً ایسا ہی ہو گا'' اس نے آہ بھر کر کہا ''تاہم ہمیں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ

یہ جدولیں کس نے مرتب کیں اور کہاں مرتب کیں؟ شاید وہ کوئی کلدانی ہوگا۔ یا کوئی بابل کا قدیم باشندہ یا پھر وہ کوئی ہندو یا مغرب کا یونانی ہوگا۔ کون جانتا ہے"۔

جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ مشاہدات کہاں کیے گئے تھے۔ یہ جدولیں صحیح کام کرنے کے سلسلے میں بے کار محض ہیں۔ بطلیموس کو معلوم تھا مگر عظیم مصری نے اس گم نام شاہد کی حیثیت کو پردہ راز میں رکھا۔

"چند روز میں" عمر نے اطمینان سے کہا "میں تمہیں وہ مقام بتا دوں گا جہاں یہ مشاہدات کیے گئے تھے لیکن اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے"۔

خواجہ میمون جب مینار سے اتر کر اپنے حجرے کی طرف جا رہا تھا تو اس کے دل میں ایک موہوم امید ابھر رہی تھی۔ ایک شخص جس نے یہ معجزہ دکھایا ہے ممکن ہے دوسرا معجزہ بھی پیش کر سکے۔ حالانکہ ریاضی کی دنیا میں معجزے رونما ہوتے ہوئے اس سے قبل اس نے کبھی نہ دیکھے تھے مگر جب اس نے اپنے حجرے کے باہر اپنے مددگاروں کو بے چینی کے عالم میں یکجا پایا جو نماز صبح کے بعد سے اس کا انتظار کر رہے تھے تو بوڑھے منجم نے اپنا سر بلند کر کے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ اس نے سچ پوچھیے تو ان پر رعب جمانے کے لیے ایسا کیا۔

عزیز طالب علمو! اس نے بڑی تمکنت سے انہیں مخاطب کیا۔ "خواجہ عمر نے اور میں نے غلطی پکڑ لی ہے۔ نو سال کے بعد میں نے جغرافیہ داں بطلیموس کے مرتبہ ستاروں کی جدول میں غلطی کا انکشاف کیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم اس غلطی کی اصلاح بھی کر لیں گے لیکن اس وقت تو میں بے حد تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا

ہوں"۔

وہ اپنی عبا سمیٹتا ہوا بڑے وقار سے اپنے حجرے میں داخل ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے تمام مددگار سناٹے کے عالم میں خاموش کھڑے رہے۔

لا الہ الا اللہ ایک نے سرگوشی کے انداز میں کہا "بوڑھا خبطی بھی شاید شیراز کی شراب سے مخمور ہو رہا ہے۔

دھوپ گھڑی کی سوئی کے سائے کی کیفیت اور پن گھڑی کی مدد سے سورج کے طلوع و غروب کی ساعتوں اور دقیقتوں کا اندراج یہ تھا بیت النجوم کا مقررہ کام، جس کے علاوہ اس کے آئندہ اور کوئی نیا کام شروع نہ ہوا۔ البتہ عمر مسلسل محنت کرتا رہا۔ بقول مددگاروں کے وہ اس طرح کام کرتا رہا جیسے اس پر کسی جن کا سایہ ہو۔ اس نے کتب خانے سے بطلیموس کے جغرافیے کا نسخہ منگوایا اور اس کے بعد قدیم یونانی منجموں کے ناموں کے فہرست بھی طلب کی۔

وہ زیادہ تر خاموشی سے کام کرتا رہا۔ اعداد و شمار سے بھرے ہوئے صفحے کے صفحے وہ میمون کو جانچنے کے لیے دیتا رہا۔ میمون مجبوری کے عالم میں ایک ایسا کام کرتا رہا جس کی صحیح نوعیت کا اسے علم نہ تھا۔ اس کی کیفیت ایک ایسے عمل جراحی کا مشاہدہ کرنے والے کی سی تھی جس کے کامیاب ہونے کی امید کم ہو۔ البتہ اسے یہ اندازہ ضرور تھا کہ عمر غلطی کا تناسب معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس تناسب کی مدد سے وہ اسکندریہ کے شمار یا جنوب میں اس رصدگاہ کا فصلہ متعین کرنا چاہتا ہے۔ جہاں جدول کے اندراج کیے گئے تھے۔ بہر حال آخر میں اس کا ایک اندازہ ضرور ہو

گیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ پانچ درجہ عرض البلد کا فرق ہے۔

''نامعلوم منجم کی رصد گاہ'' عمر نے آکر کار فیصلہ صادر کیا ''اسکندریہ سے پانچ درجہ عرض البلد شمال کی جانب واقع ہے''۔

''جنوب میں کیوں نہیں؟''

''یہ صحیح ہے اس نقطے کے جنوب کی جانب نقشے میں سوائے ریگستان اور غیر معروف کوہستانی سلسلے کے اور کوئی مقام نہ تھا لیکن عمر کو نقشے پر اعتماد نہ تھا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ اسکندریہ کی جنوبی سطح زمین سے جدول میں مذکورہ بہت سے ستارے نظر نہیں آسکتے''۔

انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ مرکز جس کی انہیں تلاش ہے ہندوستان میں تو ہے نہیں اسے نیشاپور کے مغرب میں ہونا چاہیے۔ عمر کا خیال تھا کہ وہ حلب کے مغرب میں ہے جس کی وجہ سے ان کی تلاش اور بھی دشوار ہوگئی۔ کیونکہ مغرب بعید کے قدیم شہروں کا انہیں بہت کم علم تھا۔

ایک شام جب وہ اپنے تجربے کی گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے دروازے پر ایک خوش آئند آواز نے انہیں مخاطب کیا۔

''عقل و دانش کے دوستونوں کو اللہ تندرستی دے! خدا تمہاری محنت ٹھکانے لگائے!''

عمر نے اس طرح مڑ کر دیکھا جیسے کسی نے اس کے دل میں نوک دار کیل چبھو دی ہو۔ لیکن میمون نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ توتوش ایک نیلا عمامہ باندھے کھڑا مسکرا

رہا ہے۔

''بازار میں یہ کیسی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں'' تو توش نے کہا۔ کہ بیت النجوم میں کوئی عظیم دریافت ہوئی ہے؟''

عمر قلم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ''نہیں شاہراہ اعظم پر میں نے ایک چیز دریافت کی تھی ۔اس نے پرسکون انداز میں کہا اور اب تم مجھے اس کی تفصیل سے آگاہ کرو گے''۔

''غلام حاضر ہے'' تو توش نے سلام کیا ''آپ کا قدیم دوست بس آپ کے حکم کی دیر ہے''۔

''میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے وہ چاندی کا بازو بند جس پر رنگین نقش و نگار ہیں کہاں چھپا رکھا ہے اور وہ پیغام جو اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا؟''

جاسوسوں کا سربراہ بڑا ذہین آدمی تھا۔ اسے وہ بازو بند تو یاد آ گیا جو اس نے چشمے کے کنارے کھیلتی ہوئی لڑکیوں کے درمیان پھینک دیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اور حیران تھا کہ کون سے جادو کے زور سے سلطان کے نجومی کو یہ بات معلوم ہو گئی۔

''او ہو لاکھوں کی تعداد میں نقشین بازو بند ملتے ہیں۔ خواجہ شاید مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں''۔

''میں اس بازو بند کا ذکر کر رہا ہوں جو تجھے اس مسخرے نے دیا تھا اور ساتھ ہی ایک پیغام بھی پہنچایا تھا اسی کمرے میں تو نے وہ پیغام مجھ سے چھپایا اور اب ایک دوشیزہ کی موت کی ذمہ داری میری روح پر ہے۔ ایک ایسا بار جو کبھی نہ اٹھ سکے گا''

عمر کے رخسار سفید پڑ گئے۔ اور اس نے اپنی پیٹی کچکچا کر پکڑ لی ''اب تو مجھے یہ بھی بتا تو توش کہ دنیا میں بے شمار لڑکیاں ہیں۔ میں صرف ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا اور اسے تو اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی تو نے مجھ سے صریح جھوٹ بولا''۔

عمر نے آہستہ آہستہ جاسوسوں کے فربہ اندام سربراہ کی طرف بڑھنا شروع کیا اور وہ یکا یک ان آنکھوں سے خوفزدہ ہو گیا جو اس کی روح میں پیوست ہو رہی تھیں۔ عمر نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا تھا اور اس کے خوف کا بھی اندازہ لگا لیا تھا۔

''خدا کے ننانوے اسمائے صفات کی قسم'' وہ چلایا ''مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں ہے اور نہ میں نے کبھی تیری منظور نظر لڑکی کو نظر بد سے دیکھا ہے۔ ہائے کیا ہو..... میمون..... مدد''۔

عمر نے اس کا ٹینٹوا دبا کر اسے جھٹکا دیا۔ توتوش کے گلے میں آواز اس طرح پھنس کر رہ گئی جیسے جال میں پھنسے ہوئے درندے کی۔ اس کے نرم گوشت میں انگلیاں اس طرح پیوست ہو گئیں جیسے فولاد۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر ابل آئیں۔ اس نے میمون کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا۔ اور پھر خوف قابو پاتے ہوئے اس نے اپنی پیٹی سے چاقو نکال کر اندھا دھند مار دیا۔ چاقو کا پھل لباس اور گوشت کو کاٹتا ہوا ہڈی پر رکا۔ اس کے بعد اسے کلائی سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا گیا۔

وہاں پڑا ہوا' وہ تڑپتا اور سسک سسک کر سانس لیتا رہا۔ ایک سرخ دھند میں سے اس نے دیکھا کہ آدھی درجن ملازم اور عالم عمر کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے ہیں۔ ایک شانے پر سے اس کی عبا پھٹی ہوئی ہے۔ اور ایک سیاہ دھار اس کے سینے

سے بہہ رہی تھی۔

''میرے اور تیرے درمیان خون کی ندی بہہ رہی ہے کتے'' عمر نے پرسکون آواز سے کہا لیکن یہ وہ خون نہیں ہے وہ میرے دل کے اندر ہی اندر قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ اور اسے اس طرح بند نہیں کیا جا سکتا۔ دور ہو جاؤ ورنہ مارا جائے گا''۔

لوگ تو توش کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے۔ جب جعفرک نے ملازموں سے یہ واقعہ سنا تو باب طاقین پر اسی رات کو اقرونوس سے بیان کیا کہ عمر نے غصے سے مغلوب ہو کر جب جاسوسوں کے سربراہ پر حملہ کیا تو اس نے عمر کو زخمی کر دیا۔ اقرونوس نے اس واقعے کو اس قدر اہمیت دی کہ جعفرت کے رخصت ہونے کے بعد بازار سے ایک قاصد کو طلب کیا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دو لفظ لکھے اور بغیر بند کیے اسے دے کر کہا کہ اسے لے کر سیدھے چلے جاؤ اور وہاں پہنچ کا قافلہ کے سالار کے پاس جانا اور زور سے چلا کر اعلان کرنا کہ آقائے بیعتہ کے لیے ایک پیغام لایا ہوں اور جب وہ تیرے پاس آئے تو یہ پرچا اسے دے دینا۔

''لیکن حضور!'' غلام نے اعتراض کیا ''یہ مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ وہ حقیقتاً آقائے بیعتہ ہے؟ یہ بڑا عجیب سا نام ہے''

''جب وہ آئے گا تو تجھے بتا دے گا''۔

''واہ! یہ تو ایک طرح کا جادو ہوا''

اس نے غلام کو پیغام کے متعلق بڑا تجسس ہوا۔ اس نے کاغذ کھول کر کئی مرتبہ ان دو لفظوں کو دیکھا باوجود وہ سیدھے سادے لفظ دکھائی دیتے تھے اور اسے اطمینان بھی

تھا لیکن مزید احتیاط کے لیے اس نے ایک ملا کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو اسے پڑھ کر یہ یقین دلا دے کہ ان الفاظ کے اثر سے اس پر کوئی مصیبت تو نازل نہ ہو جائے گی۔

''ساعت شد'' ملا نے بآواز بلند پڑھا ''وہ وقت آ گیا ہے یا آغاز کا وقت آ گیا ہے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

شانے کی مرہم پٹی کے بعد عمر نے اپنے کمرے میں مقیم رہا۔ اسفزاری نے اتفاقاً جھانک کر دیکھا اور بیان کیا کہ وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ان میں سے کچھ کاغذ فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔

رصدگاہ میں میمون نامکمل اعداد و شمار کی تکمیل میں مصروف رہا۔ بغیر عمر کی امداد کے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ نقشہ غلط تھا اور یونانی منجموں کی فہرست اس کے لیے بے معنی تھی۔ کچھ بے نتیجہ تجربے کرنے کے بعد وہ رصدگاہ سے واپس آ گیا۔

وہ اس شب تک رصدگاہ سے واپس نہیں آیا تا کہ اسفزاری نے اسے مطلع نہ کیا کہ دفتر کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ حالانکہ کوئی مددگار بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ بوڑھا منجم تیزی سے اس طرف گیا اور چھوٹی میز پر عمر کو جھکا ہوا بطلیموسی مخطوطے کے مطالعہ میں غرق پایا۔

''جس نقطے کی ہمیں تلاش ہے وہ ایشیائے کوچک کے مغرب میں واقع ہے'' اس نے کہا ''مجھے اب یقین ہو گیا ہے''

میمون کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ''لیکن اس کے مغرب میں تو صرف سمندر

ہے"۔

عمر نے سر ہلایا۔

افسوس ہماری جستجو بیکار ہے۔

"نہیں اب وہ قریب الختم ہے۔ کیونکہ اس سرزمین پر پرانے زمانے میں بہت سے شہر آباد تھے۔ سمندر میں بھی اکثر چپر تھے عمر منجموں کے فہرست بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اروایک کے بعد دوسرا نام قلم زد کرتا جاتا تھا۔ ایک جگہ آ کر اس کا قلم رک گیا۔

"جزیرہ رہوڈس" اس نے زیر لب کہا "رہوڈس کے ہپارکوس نے ایک ہزار ستاروں کی جائے وقوع متعین کی تھی۔

بوڑھے منجم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اسکی باریک شریانوں میں گرم گرم خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ ایک بخیل کی حرص سے بھی زیادہ گرم، کسی ان دیکھے دیس کے کھوجی کی بھوک سے بھی زیادہ تیز وقت قریب تھا کہ وہ سائنس کا ایک ایسا راز معلوم کرلیں جو نو صدیوں سے پردہ خفا میں مستور تھا۔

"اوہو" اس نے بلند آواز سے کہا "تو گویا بطلیموس نے ہپارکوس کے ایک ہزار اسی نام اپنی المجسٹی میں لکھ لیے۔ اگر یہ صحیح ہے..... اگر یہ صحیح ہے!"

"میں سمجھتا ہوں یہ صحیح ہے" عمر نے بے پروائی سے کہا "اب ہمیں رہوڈس کو مرکز تسلیم کر کے ان جدولوں کی جانچ کرنی چاہیے۔ شہر رہوڈس اور ایک ہزار چونتی سال قبل مسیح (۱۰۳۴ ق۔م)۔

''اچھا اب ہم دونوں الگ الگ اسے جانچتے ہیں'' میمون پر ایک خوف طاری تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس دریافت کی شہرت میں شرکت کا بھی متمنی تھا۔

وہ تین دن تک مسلسل کام کرتے رہے۔ بہت کم سوئے۔ بغداد کے عالم نے شاذونادر ہی اپنے سامنے رکھے ہوئے صفحوں سے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں ہٹائیں مگر عمر بہت خوش خوش بڑی تیزی سے کام کرتا رہا۔ کھانا بھی انہوں نے کبھی کبھار کھالیا۔ کبھی کسی وقت رات کو یا پھر کسی دن صبح کے وقت حتی کہ عمر نے اپنا صحت مند ہاتھ پھیلا کر ہنستے ہوئے کہا ''بس کافی ہے اتنا ہی کافی ہے''

''نہیں ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے'' میمون نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس کے خیال میں ابھی تو کام کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن جب دونوں نے اپنے اپنے اعداد و شمار کا موازنہ کیا تو میمون کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔

''قسم ہے کعبے کی قسم ہے آب زم زم کی..... یہ ایک حقیقت ہے کہ حکیم بوعلی سینا بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اسے بھی کبھی شک و شبہ نہ ہوا۔ خواجہ عمر!'' اس نے خیام کو اپنے آغوش میں لے کر خوب پیار کیا۔ اب ہمارے پاس بالکل صحیح جدول موجود ہے۔ خواجہ عمر جو طرح بطلیموس نے رہوڈوس کے ہپارکوس کی جدول استعمال کی تھی ہم بھی اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں'' میمن کو جی چاہا کہ وہ فوراً صحن میں جا کر بیٹھے اسے خواہش ہوئی کہ اس شاندار دریافت کی تفصیل اپنے شاگردوں کو بتا کر محظوظ ہو بلکہ نیشاپور کی بڑی درس گاہ میں جا کر اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھے

اور مزے لے لے کر انہیں اپنی اس کامیابی کی روئیداد سنائے۔ لیکن عمر نے اجازت نہ دی۔

عمر نے خواجہ میمون کو سمجھایا کہ پہلے ہی علمائے دین کہتے ہیں کہ وقت کی پیائش سرعا ممنوعہ ہے اور وہ خبیث روحیں اس کام میں ہماری مدد کرتی ہیں جو بیت النجوم کے مینار میں مقیم ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اپنے مقصد کے لیے ایک کافر یونانی کی جدولیں استعمال کر رہے ہیں تو تم خود ہی سوچو کہ وہ کیا کچھ نہیں کہیں گے'' اس وقت تک انتظار کرو کہ ہماری تحقیقات مکمل صورت میں سلطان کے حضور پیش ہوں''۔

''خواجہ عمر آپ سچ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک حنبلی نے ہمیں برا بھلا کہتے ہوئے ایک جلتی ہوئی مشعل مینار پر پھینکی تھی۔ اور آپ جب حلب میں تھے تو ایک شب جب ہم سورج گھڑی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجد سے آنے والے ایک ہجوم نے ہم پر پتھراؤ کیا تھا۔ ہمیں ابھی اس راز کے سلسلے میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت ہی لگا دینی چاہیے''۔

اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ عمر اس قدر جلد نئے کام کی طرف کیوں کر متوجہ ہو گیا۔ اسے اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ عمر کا دماغ جدولوں سے ہٹ کر ایک ایسے علاقے میں جا پہنچا تھا۔ جہاں ایک لڑکی عالم نزع میں کراہتے ہوئے عمر کے بازو سے لپٹی جا رہی تھی۔

اس تصور کی حیثیت تپتی دھوپ میں اس سایہ دار جگہ کی سی تھی جو ایک بہتے دریا

کے کنارے واقع ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ یاسمین کا حسین مجسمہ مسکراتے ہوئے چہرے اور اپنے سیاہ گھنے والوں کو جھٹکا دے کر اپنے شانوں پر ڈال رہی ہے لیکن عموماً دریا کا منظر اس کی نگاہوں میں تیرتا رہتا۔ اور ایک درد کی سی کیفیت اس پر طاری رہتی اسفزاری نے ایک دفعہ کہا کہ وہ اس انہماک سے کام کرتا ہے جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ یا پھر وہ یک لخت کام چھوڑ کر خاموشی سے شراب پینے بیٹھ جاتا۔

''وہ عجیب وغریب قوت کا حامل ہے'' میمون نے بڑے اعتماد اور وثوق سے جواب دیا یہ اس کی عادت ہے۔ اگر اس کی دماغی قوتوں نے اس کا ساتھ دیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بطلیموس کی تمام محنت پر پانی پھیر دے گا۔''

لیکن جعفرک اکثر و بیشتر خیام ک پاس گزارتا۔ وہ اپنے دوست کے قدموں میں لیٹا چراغ کی لو سے پیدا ہونے والے سایوں کو دیوار پر تھرکتے دیکھتا رہتا اس دوران میں نہ تو وہ فقرے بازی کرتا نہ کوئی مسخرگی..... ''جب میرے آقا سلطان الپ ارسلان دوسری دنیا کو سدھارتے تھے'' اس نے لیٹے لیٹے کہا ''تو جب تک میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سمندر نہ بہ گیا میرے دل کو سکون نہ ملا مگر اے میرے دوست خیام۔ ساغر میں بھری ہوئی اتنی ساری شراب بھی تجھے رلانے میں کامیاب نہیں ہوتی''۔

عمر نے ساغر پر نظر ڈالی جو اس کے ہاتھ سے چھلک رہا تھا۔ یہ ساغر چاندی کا بنا ہوا تھا اور اس پر لاجورد کے بیل بوٹے تھے۔ جب تمہیں نیند نہ آئے تو تم شراب پی کر مدہوش ہو سکتے ہو۔ یہ بات بہر کیف اس سے تو بہتر ہے کہ تم اس سوچ میں

ڈوبے رہو کہ تم کیا ہو؟..... اور تم کیوں ہو؟''

''لیکن اس عمل سے دل کو سکون و اطمینان تو میسر نہیں آتا''۔

''اس سے خود فراموشی حاصل ہوتی ہے۔ جعفرک تم جانتے ہو کہ یہ جام (۲) اس وقت کیمیا کے کیسے کیسے رازوں کا حامل ہے۔ اس کا یاک گھونٹ ہزاروں تفکرات سے آزاد کر دیتا ہے۔ اسے پی کر تم یہ محسوس کرو گے کہ جیسے محمود کے سنہری تخت پر متمکن ہو اور تمہارے کانوں میں ایسی سریلی موسیقی رس گھولتی معلوم ہو گی جیسے براہ راست حضرت داؤد علیہ السلام کے لبوں سے آ رہی ہو..... اچھا اب تمہی بتاؤ جس شخص نے اس جام کو تخلیق کیا ہے کیا وہ اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟..... بولو!''۔

''نہیں..... خدا نہ کرے''۔

''تو پھر محبت ایک حسین وجود میں کس بات کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اور انتقام سے کیا چیز ضائع ہو جاتی ہے؟''

عمر نے فرش پر سے ایک مروڑے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر جعفرک کی طرف پھینکا۔ مسخرے نے اس کی تمام سلوٹیں دور کر کے روشنی کے سامنے کیا تو اسے نظر آیا کہ کاغذ پر منجم کے صاف ستھرے خط میں ایک رباعی کی چار سطریں تحریر تھیں:

ایں قافلہ عمر عجب می گزرد
دریاب دمی کہ باطرب می گزرد
ساقی غم رادی حریفاں چہ خوری

چ ج آ ر پیالہ را کہ شب می گز رد

"افسوس" جعفر ک نے ایک آہ بھر کر کہا یکا یک اس کا دانش افروز چہرہ چمک اٹھا لکھو..... اور بہت سے شعر لکھو..... یہ تمہارے آنسوؤں کا نعم البدل ہے"۔

ایک سال گزر گیا جب بیت النجوم کے منجموں نے اپنی اپنی تحقیقات کا موازنہ اور مقابلہ کیا تو خواجہ میمون اور اسفزاری بے حد خوش ہوئے کیونکہ طلوع و غروب آفتاب کے اندراجات جو انہوں نے خود کیے تھے ستاروں کے اندراجات جو پن گھڑی کی مدد سے کیے گئے تھے ساعت بہ ساعت مل گئے تھے۔

یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ایک سال ۳۶۵ دن اور پانچ یا چھ گھنٹوں کا ہوا ہے اور یہ صورت حال قمری تقویم سے جو مسلمانوں میں رائج ہے یقیناً بہتر ہے۔ جس کی رو سے سال میں ۳۵۴ دن ہوتے ہیں انہیں معلوم تھا کہ قدیم مصری منجموں نے کوئی ایسی جنتری بنائی تھی جو بارہ مہینوں پر مشتمل تھی۔ ہر مہینہ تیس دن کا ہوتا تھا اور سال کے آخر میں پانچ دن تقریبات کے لیے رکھے تھے..... اس طرح کل ۳۶۵ دن ہوتے تھے۔

"محض ایک چوتھائی دن ہمیں ۳۶۵ دنوں میں اور شامل کرنا ہوگا" اسفزاری نے تجویز پیش کی "اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم ہر چوتھے سال کے دنوں میں ایک پورے دن کا اضافہ کریں؟"

لیکن عمر اور میمون نے اسے یاد دلایا کہ ہماری جنتری صرف چار سال یا چالیس سال کے استعمال کے لیے ترتیب نہیں دی جا رہی۔ بلکہ اس کا نفاذ آنے والی

صدیوں تک رہے گا۔ لہٰذا انہوں نے طے پایا کہ یہ مشاہدات آئندہ سال بھی کیے جائیں تاکہ گزشتہ سال کے مشاہدات سے ان کا موازنہ کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچا جا سکے۔ اس کامیابی کی خبریں نیشاپور کے ملاؤں کے کانوں میں بھی پہنچ گئیں جو منجموں کے خلاف عوام کو بھڑکاتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں منجم کافروں کے بنائے ہوئے آلات استعمال کرتے تھے اور ان مردوں کی روحوں سے ہم کلام ہوتے تھے۔ جو قبرستان کی کہنہ و بوسیدہ قبروں میں مقیم تھیں۔

میمون نے اشور وغونا کی طرف بہت کم توجہ دی اور عمر نے تو اسے بالکل نظر انداز ہی کر دیا لیکن اس کے بوڑھے منجم کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ خیام کوئی نیا مسئلہ حل کرنے میں منہمک ہے۔ جس کی نوعیت کا اسے اندازہ نہ تھا۔ لیکن اس بات کا اسے ضرور یقین تھا۔ یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ بطلیموس نے ہپارکوس کے علم سے استفادہ کیا تھا۔ عمر نے رہوڈ کے عالم کے مخطوطات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ایک جدید انداز کی تحقیق میں مستغرق تھا۔

''اس کا تعلق چاند گرہن سے مشابہت رکھنے والی چیز سے تھا۔ یہاں تک تو بات بالکل صاف ہے۔ میمون نے اسفزاری کو بتایا۔'' اس کے علاوہ عمر اشکال ندلولی کی مدد سے بھی مسائل حل کرنے میں مصروف ہے۔ جن میں نامحدود اعداد سے بحث کی جاتی ہے''۔

خدائے رحمٰن و رحیم اس کی رفاقت کرے اسفزاری جو میمون کے مقابلے میں کم عمر اور جرات مند تھا ہنسنے لگا عام اعداد کا شمار ہی میرے دماغ کا کچومر نکالنے کے لیے

کافی ہوتا ہے''۔

وہ صفر (۳) کا دائرہ استعمال کر کے حساب لگا رہا ہے''۔

''یعنی خلا.....''

''ہاں..... وہ دائرہ جس کے بعد کچھ نہیں..... یونانی صفر لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا بیان ہے کہ صفر کے بعد..... اس خلا کے بعد..... خیالی اعداد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

اسفزاری نے کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد بے خیالی میں سر کو جنبش دی ''یہ تو کسی یونانی کا خواب معلوم ہوتا ہے وہ ہمیشہ تکمیل کے خواب دیکھتے رہے اور آپس میں ایک دوسرے سے اس بات پر لڑتے جھگڑتے رہے کہ اس ''تکمیل'' کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علماء میں سے جس کا نام رقم یا اس سے ملتا جلتا کوئی نام تھا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعے زمین کو حرکت میں لایا جا سکتا تھا بشرطیکہ اسے زمین سے باہر کھڑے ہونے کے لیے کوئی جگہ مل جائے اور جب وہ یہ خواب دیکھ رہا تھا تو میدان جنگ میں اسے ایک معمولی سپاہی نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد قدیم زمانے میں ان کے سلطان اعظم سکندر نے ایشیا کے بیشتر ممالک فتح کیے۔ جی ہاں اس نے یہ طے کیا تھا کہ تمام روئے زمین کو اپنی سلطنت میں شامل کرے گا لیکن کیا نتیجہ ہوا۔ بے چارہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے جوان مرگ ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ہمارے آقا عمر سے بس کچھ ہی زیادہ ہو گی۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کے امرا نے آپس میں لڑ مر کے اس کی مملکت کے حصے بخیے کر

لیے۔ اب تو مجاہدین اسلام ان یونانیوں کا قلع قمع ہی کر ڈالا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یونانیوں نے جو خواب کی تکمیل و ترقی کے دیکھے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا''۔

''آقائے عمر کہتا ہے کہ خیالی اعداد کا وجود ثابت ہے۔ جب وہ ایک خلا (عدم) سے وجود میں لاتا ہے تو صفر کو اس طرف ایک مثبت عدد خارج کر دیتا ہے''۔

''خدا کرے ملاؤں کو اس کی خبر نہ ہو''۔

اسفزاری اپنے نوجوان مددگاروں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ دوران گفتگو نے کہا حجتہ الحق نے نشے کی ترنگ میں اشکاہد لولی کو ستاروں پر منطبق کر کے خیالی اعداد کی صفیں صاف کر دیں

''اور سنو ایک شب وہ مینار سے نیچے اتر کر نیچے قبرستان میں جا بیٹھا۔ اس کے ہمراہ وہ مالی بھی تھا جو باغ میں لالے کے تختوں کی دیکھ بھال کرتا ہے''۔

سال ختم ہو گیا تحقیقات و مشاہدات کے آخری اندراجات کی تکمیل کی گئی اور عمر اور میمون کو اپنی تقویم کو مکمل کرنے کے لیے آکری دن کے مناسب جزو کا حساب لگانے کے لیے جم کر بیٹھ گئے۔

ایک چوتھائی دن میں چند لمحوں کا فرق ہوتا تھا۔ میمون کے خیال میں 7/29 لیکن عمر کے حساب سے 8/33 کا (۴)

لہٰذا عمر نے فیصلہ کیا کہ اس طرح ہم ۳۳ سال میں آٹھ دن زیادہ شمار کریں گے''۔

دونوں نے مل کر سالہا سال پر مشتمل جدولیں مرتب کیں جنہیں نظام الملک کی

خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وہ بے چینی سے ان کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ میمون اور اسفزاری درباری خلعت پہن کر قلعہ نیشاپور میں نظام الملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقویم کا نسخہ پیش کیا۔

اور نظام الملک نے اسے سنہری نقش و نگار سے آراستہ کرانے کے بعد سرخ ریشم کے کپڑے کی جلد بنوائی جس پر اژدھے کی تصویر زردوزی کی گی تھی۔ اس مطلا میں منقش اور خوبصورت جلد کو اس نے بہ نفس نفیس ملک شاہ کے حضور میں پیش کیا۔

''سلطان الشرق و الغرب!'' نظام الملک نے بڑے ادب سے عرض کیا ''خداوند نعمت کے حکم سے حضور کے غلاموں نے نئے سرے سے وقت کا شمار کیا ہے۔ انہوں نے وقت کے پچھلے تمام تخمینوں کو غلط پایا۔ اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق یہ گوشوارے حاضر ہیں جن سے آئندہ آنے والے وقت کا صحیح شمار کیا جائے گا۔ میں حضور کے مبارک ہاتھوں میں وہ دستاویز دے رہا ہوں جو اس وقت تک استعمال ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان اس خاکدان زیست میں سانس لیتا رہے گا''۔

ملک شاہ نے بڑے اشتیاق سے اسے لیا۔ زردوزی کیا ہوا اژدھا بھی اسے اسی قدر پسند آیا جس قدر کہ تقسیم جسے وہ ما حقہ سمجھ نہ سکتا تھا لیکن اژدھا اس کا اپنا نشان تھا۔ اس کا اپنا ستارہ تھا۔ آسمان بین اور دانش مند عمر خیام اسے دیکھ کر اس کے حق میں پیشن گوئی کر سکتا تھا کہ اس کا ستارہ اقبال روشن رہے گا۔

''خوب سلطان نے اظہار خوشنودی کرتے ہوئے کہا۔ ان تمام اہل علم کو خلعت

اور اشرفیوں کی تھیلیاں انعام میں دو جنہوں نے بیت النجوم میں بیٹھ کر انتھک محنت کی ہے۔ لیکن ہمارے منجم کو چھوٹا کوہستانی محل 'قصر کوچک' میں عطا کیا جائے''۔

نظام الملک نے جھک کر کورنش بجالاتے ہوئے اس انداز سے زیر لب کہا کہ سلطان کے کانوں تک پہنچ سکے ''اب صرف حضور کے حکم کی دیر ہے کہ موسم بہار کی اس شام کو جب شب و روز نقطہ اعتدال پر ہوتے ہیں قمری جنتری کی جگہ حضور کی تمام قلمرو میں یہ نئی جنتری جاری کر دی جائے۔ اس شام ایک نئے دور کا آغاز اور پہلا سال شروع ہوگا اور وہ دور جو خداوند نعمت کے نام سے موسوم ہوگا اسم ہمایونی کی مناسبت سے ہم اسے جلالی سال کہیں گے''۔

اگلے موسم بہار میں مقررہ دن کی شام کو جب روشنی اور سایہ نقطہ اعتدال پر تھے ملک شاہ اپنے تمام درباریوں کو جلو میں لیے ہوئے قلعے کے مینار کی چوٹی پر جلوہ افروز ہوا۔

وسیع میدان کے اس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔ نیشاپور کے عوام نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر قالین بچھا رکھے تھے اور قندیلیں لٹکا رکھی تھیں۔ ہر طرف رونق تھی کیونکہ جس رات جشن منایا جا رہا تھا۔ چھتاروں (۵) کی آواز اور عورتوں کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ ہر طرف سڑکوں پر نقیب اعلان کر رہے تھے کہ نئے دور کی پہلی ساعت بس آیا ہی چاہتی ہے۔

سنہری زردوزی سے جگمگاتے ہوئے ایک خلعت میں ملبوس عمر خیام' نوجوان سلطان کے شانہ بشانہ کھڑا تھا جو زمین کے آخری کناروں پر آفتاب کو غروب ہوتے

دیکھنے کے لیے منہمک تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ البتہ سورج کے عقب میں بادلوں کی ایک تہہ ضرور نظر آتی تھی۔ جو ڈوبتے سورج کی سرخ کرنوں کے عکس سے اور زیادہ گہری اور سرخ ہوگئی تھی۔

دیکھو ایک باریش ملا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اللہ نے موت کے پرچم آسمان پر کس طرح لہرا رکھے ہیں۔

ہر شخص نے مڑ کر اس ملا کی طرف دیکھا۔ لیکن امیر الامراء نے بڑے زور سے چلا کر کہا ملاحظہ فرمایئے سلطان عالم عظمت پناہ و نصرت دستگاہ! ملاحظہ فرمایئے حضور کے زرین دور کی پہلی ساعت شروع ہوتی ہے"۔

سورج کا آخری کنارہ بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ صرف خالی خولی خون آلود آسما اور اس کے نیچے تاریک زمین باقی رہ گئے۔ سڑکوں سے لاتعداد ملی جلی آوازوں کا شور اور قلعے کے مینار کے صحن سے شادیانوں کی صدائیں آنے لگیں۔ عمر نے فصیل کے قریب جا کر نیچے دیکھا ہر چیز سے بے پروا۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھندلی دھندلی نظر آنے والی پن گھڑی اپنا کام خاموشی سے انجام دے رہی تھی۔ جو قطرہ ٹپکتا تھا نئے وقت کا اعلان کر رہا تھا' لیکن کیا وقت کی رفتار میں کبھی فرق آیا ہے؟ جمشید اور کیخسرو کے زمانے میں بھی یہی سورج سطح زمین کو اپنی روشنی بخش رہا تھا۔

"کیا آنے والی صبح" ملک شاہ نے عمر کے کان میں کہا "ہرن کے شکار کے لیے مبارک ہوگی"

عمر نے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے کہا "میں حساب لگا کر بتا سکتا ہوں

اگر سلطان معظم رخصت ہونے کی اجازت مرحمت فرمائیں''

عمر محل سے نکل آنے پر بہت خوش ہوا۔ جعفرک نے آدھی رات کے بعد جب اسے تلاش کیا تو وہ اپنے مطالعہ و عمل کے کمرے میں قندیل روشن کیے ہوئے تنہا بیٹھا تھا حالانکہ نیشاپور کا ہر فرد جشن منا رہا تھا' ہو ہنوز درباری خلعت میں ملبوس تھا۔

''ہمارے آقائے نامدار سلطان عالم مسخرے نے بلند آواز سے کہا ''شکار کو روانہ ہونے کے لیے نیک ساعت معلوم کرنے کے منتظر ہیں''۔

''تو پھر جا کر عرض کر دے کہ میں نے زائچہ دیکھ لیا ہے..... نہیں..... ہاں جا کر کہہ دے کہ سلطان عالم جب وقت چاہیں اور جہاں چاہیں بلا خوف و خطر شکار فرما سکتے ہیں''

''لیکن ملا کہتے ہیں کہ موت کے پھریرے آسمان پر لہرا رہے ہیں''۔

''ملا تو اس لیے بری فال نکالتے ہیں کہ وہ نئی تقویم سے ناراض ہیں' لیکن ملک شاہ آج بھی آفات سے اتنا ہی محفوظ ہے جیسا کہ کل تھا''۔

''آقا آپ کو یقین ہے؟

''بے شک!'' عمر نے بڑے وثوق سے کہا

جعفرک کو اب بھی تامل تھا ''اچھا میں جاتا ہوں لیکن کیا آپ یہاں اسی طرح تنہا بیٹھے رہیں گے۔ محل قہقہوں اور نغموں سے گونج رہا ہے۔ وہاں ہر شخص خوشی سے سرشار ہے''۔

''اور میں..... یہاں'' عمر نے بڑی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا ''میرے

شریک نشاط! تو وہ کچھ دیکھے گا جو تجھ سے انسانوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا''۔

جعفرک نے اثبات میں زیر لب کچھ کہا تکلیف اور اعتبار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ خاموشی اور تنہائی میں اسے کبھی خوشی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اپنے بھاری خلعت سے بے پروا عمر اک دم کھڑا ہو گیا اور مینار کے زینے کی سمت چل پڑا۔ وہ اندھیرے میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر تانبے کے بنے ہوئے گلوب کے نزدیک پہنچ گئے۔

''ادھر دیکھ جعفرک تجھے کچھ نظر آتا ہے؟''

''ستارے صاف شفاف آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے''۔

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر غور کرنے لگا۔ تو صحیح ہے کہ وہ ستاروں کو حرکت کرتے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن بیت النجوم کے قیام کے دوران میں اسے اس بات کا علم ضرور ہو گیا تھا کہ ستارے بھی چاند سورج کی طرح طلوع ہوتے اور ڈوبتے ہیں۔ وہ جوزا کے چمکدار سرے کو دیکھ کر یہ بتا سکتا تھا کہ رات آدھی ڈھل چکی ہے۔ ''وہ اکثر کہتا ہے یقیناً ستارے حرکت کرتے ہیں۔ وہ ہر روز آہستہ آہستہ زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ میں نے اس سے قبل بھی اس کا بارہا مشاہدہ کیا ہے''۔

''اور یہ ہماری زمین یہ کیا چیز ہے''؟

''گیند کی طرح گول ہے۔ میرے آقا بالکل اس تانبے کے بنے ہوئے کرّے کی طرح۔ یہ ہر چیز کا مرکز ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور بس صرف یہ زمین ہی

ساکت ہے اور اپنی جگہ رپ قائم ہے۔ خواجہ میمون نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔

کچھ دیر عمر انتظار کرتا رہا۔ دریا کے کنارے رات کو اڑنے والے پرندے اپنے بازو پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ایک الو خاموشی سے اڑتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے چہروں پر سرسرانے لگے۔

''میں نے یہ مشاہدہ کرنے کے لیے دو سال کی محنت کی ہے'' عمر نے شگفتہ لہجے میں کہا ''اور اب میں دیکھ رہا ہوں جعفرک ذرا ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھ۔ روشنی کے یہ لاتعداد نقطے ہمیشہ باقی رہنے والے ستارے حرکت نہیں کرتے انسان کے وجود سے پہلے بھی یہ وہاں موجود تھے دور بہت دور''۔

''نہیں میرے عزیز! بے وقوف یہ زمین جس پر ہم کھڑے ہیں حرکت کرتی ہے۔ یہ گیند سی گول زمین ایک دن اور ایک رات میں اس طرف سے اس طرف چکر لگا لیتی ہے۔ اوپر نظر اٹھا کر ان ستاروں کو دیکھ یہ کیسے نظر آتے ہیں''۔

یکا یک جعفرک نے اپنی گردن جھکالی اور کانپنے لگا ''آقا مجھے ڈر لگ رہا ہے''۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''رات بدلی بدلی نظر آ رہی ہے کسی غیر مرئی طاقت نے آپ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔ مجھے یہ مینار گھومتا ہوا محسوس ہو رہا ہے'' اس کے جسم کی کپکپاہٹ اور زیادہ ہو گئی اور اس نے فصیل کی دیوار کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میرے آقا! اپنے الفاظ واپس لیجیے..... نہیں تو..... نہیں تو..... نہیں تو ہم گر پڑیں گیل مجھے یہ مینار حرکت کرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اور ہم ضرور گر پڑیں گے''۔

عمر نے تحکمانہ انداز میں چلا کر کہا ''نہیں ہر ہر گز نہیں کر سکتے صرف زمین گھومتی ہے اور ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ہم بھی دوسری دنیاؤں کے ساتھ ساتھ خلا میں پرواز کر رہے ہیں جو ممکن ہے سورج کی طرح طاقتور دور افتادہ اور قائم بالذات ہوں۔ کیا تجھے نظر آتا ہے کیا تو یہ سب محسوس نہیں کر سکتا جعفرک؟''

''خدا مجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے''۔

اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر جعفرک سسکیاں لینے لگا۔ اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ آقا جس پر وہ جان چھڑکتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''مجھے اب جانا چاہیے۔ مجھے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر شکار پر روانہ ہونے کے لیے نیک فال کی گزارش کرنی چاہیے۔

اور وہ زینے کے اندھیرے کنوئیں میں اتر گیا۔ خوف نے اس کی آنکھوں پر تاریک نقاب ڈال دی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ ایک قسم کا خوشبو دار پودا جس کی پتیاں بھوری سبز ہوتی ہیں اور عام طور پر پکانے کے کام آتی ہیں۔

۲۔

می خور کہ ز دل کثرت و قلت ببرد
و اندیشہ ہفتادو دو ملت ببرد

پرہیز ممکن زکیمیائی کہ ازہ

یک جرعہ خوری ہزار علت ببرد

۳۔ صفر گیارہویں صدی کے مسلمان سائنسدان قرونِ وسطیٰ کے یورپی علماء سے بہت پہلے صفر کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے بہت سے کم لوگوں کو یہ علم تھا کہ اعداد مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی (ہیر لڈ لیم)۔

۴۔ علماء کے رُخ سے اس میں عمر خیام کا محسوب ملال بڑی حد تک صحیح ہے جس کی رو سے سال میں 54، 19 سیکنڈ زائد نکلتے ہیں۔ حالانکہ آج کل جو سال رائج ہے اس میں 26 سیکنڈ زائد ہوتے ہیں۔

۵۔ ایک طرح کا ستار جس میں چھ تار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اختتام---------------------حصہ اول